مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

کے تعلیمی تصورات

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

کے

تعلیمی تصورات

ڈاکٹر ایم. نسیم اعظمی

نام کتاب	....	مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تعلیمی تصورات
نام مصنف	....	ڈاکٹر ایم. نسیم اعظمی
ناشر	....	عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن (یو. پی.)
سن اشاعت	....	2008
کتابت	....	محمد افضل رازؔ (افسانہ کمپیوٹر، گھاسی پورہ، مئو)
طباعت	....	اصیلہ آفسیٹ پرنٹرز، دہلی
تعداد	....	1000
قیمت	....	Rs.100/=

MAULANA MOHD. QASIM NANOTAWI KE
TALEEMI TASAUWARAT
BY DR. M. NASEEM AZMI

ملنے کے پتے

☆ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵، پرنس بلڈنگ ممبئی ۳

☆ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶

☆ جاوید بکڈپو، کولکتہ

☆ دانش محل، امین الدولہ پارک، امین آباد، لکھنؤ

☆ بک امپوریم، ۴ سبزی باغ، پٹنہ

☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

☆ انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر راؤز ایونیو۔ نئی دہلی ۔۲

☆ کتب خانہ انجمن ترقی اردو 4181 اردو بازار جامع مسجد دہلی ۔۶

☆ حسامی بک ڈپو چارکمان، حیدرآباد

☆ اردو بک ریویو 1739/3 پٹودی ہاؤس، دریا گنج دہلی ۔۲

☆ مکتبۃ الفہیم، صدر بازار مئوناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱

☆ رحمانی پبلیکشنز 1032 اسلام پورا، مالیگاؤں ناسک (مہاراشٹر)

☆ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج دہلی

☆ ساقی بک ڈپو، اردو بازار دہلی

☆ کتابستان 30 چک الہ آباد

☆ نظیر بک ڈپو چمنگی

☆ مسکین بک ڈپو، جے پور

☆ کلیم بک ڈپو، احمد آباد گجرات

☆ عثمانیہ بک ڈپو، لور چیت پور، کولکتہ

مصنف کا مختصر تعارف

نام	محمد نسیم
قلمی نام	ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی
والد کا نام	جناب عبدالعلیم مرحوم ابن جناب خدا بخش مرحوم
والدہ کا نام	محترمہ بی بی قریشہ بنت جناب ثناءاللہ سوداگر مرحوم
تاریخ پیدائش	۱۲ر جنوری ۱۹۵۸ء
تعلیم	ایف. ٹی.، ایم. اے.، این. ای. ٹی.، پی. ایچ. ڈی.
مشغلہ	درس وتدریس اور آزاد صحافت

تحریری تصنیفی اور تہذیبی سرگرمیاں

۱-	آثر انصاری فکر وفن کے آئینے میں	۱۹۹۸ء
۲-	نوائے سروش	۲۰۰۱ء
۳-	تعلیمی تجزیے	۲۰۰۲ء
۴-	تعلیمی جہات	۲۰۰۶ء
۵-	آثر انصاری۔ حیات اور خدمات	۲۰۰۷ء
۶-	مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تعلیمی تصورات	۲۰۰۸ء
۷-	راجا رام موہن رائے کے تہذیبی و تعلیمی کارنامے	زیرترتیب
۸-	اردو شعراء میں خود نقدیت کی روایت	زیرترتیب
۹-	اردو تنقید آزادی کے بعد	زیرترتیب
۱۰-	نقدِ سخن	زیرترتیب

☆ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۹ء تک ماہنامہ "ادب نکھار" کی اشاعت وادارت

☆ ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۱ء تک ہفت روزہ ''ادب نکھار'' کی ادارت

☆ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۹۱ء تک نکھار پبلی کیشنز اور نکھار ادبی ایوارڈ کی نظامت

☆ ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۸ء تک حراء ایجوکیشنل سوسائٹی کی نظامت

☆ ۲۰۰۷ء سے تا حال ڈاکٹر مختار احمد انصاری اکیڈمک سینٹر کے صدر

انتساب

علم دوست اور ادب نواز

حاجی

امتیاز

احمد

(سکریٹری ڈاکٹر مختار احمد انصاری اکیڈمک سنٹر)

کے نام

تاثرات

جناب مولانا زین العابدین الاعظمی صاحب

جامعہ مظاہر علوم، سہارنپور (یو. پی.)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جناب ڈاکٹر ایم. نسیم اعظمی صاحب کی اہم تخلیق "مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تعلیمی تصورات" کے ساتھ موسوم ہیں لیکن یہ کتاب صرف تعلیمی تصورات پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ مولانا نانوتوی کے حسب ونسب تعلیم وتربیت اور تصنیفات وتالیفات اور عائلی زندگی کے حالات پر بھی ایک جامع کتاب ہے۔ گو حضرت نانوتویؒ کا تعلیمی تصور اس کتاب کا اصلی موضوع ہے مگر ضمنی طور پر وہ تمام باتیں اس کتاب میں پائی جاتی ہیں جیسا کہ اس کی فہرست سے ظاہر ہے۔

جناب ڈاکٹر صاحب موصوف نے حضرت نانوتوی کے دارالعلوم دیوبند قائم کرنے اور پورے ملک میں اسلامی مکاتب کا جال بچھانے کا مقصد انگریزی انخلاء کا تصور اور احیائے اسلام کا عالمی تصوران دونوں باتوں کو قرار دیا ہے خود ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں اسکی تفصیل یہ ہے "انگریزوں نے ہندوستان مین اپنے سیاسی استحکام کے لئے تعلیم کو ذریعہ بنایا تھا تاکہ ہندوستانیوں میں سے ہی ان کے ہمنوا ان اور وفادار رعایا کی جماعت میں پیدا ہو سکے، حضرت نانوتوی نے اس تصور کے جواب میں ایک ایسا تعلیمی تصور تشکیل دیا کہ ہندوستان میں احیائے اسلام کے ساتھ انگریزوں کے انخلاء کا ذریعہ بن سکے تاکہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کا اس طرح بدلہ لیا جاسکے کہ ہندوستان کو انگریزوں کے غاصبانہ تسلط سے آزاد بھی کرایا جاسکے۔" اور اس دعویٰ کی ایک وقیع شہادت حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کی روایت سے حضرت شیخ الہندؒ کی زبانی شہادت کو پیش کر دیا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کا مقصد عصری تعلیم کی مخالفت نہ تھی بلکہ قرآن وسنت کو فروغ دینا اور دینی علوم میں اختصاص پیدا کرنا مطمح نظر تھا اور اس اختصاص میں عصری تعلیم کی پیوندکاری خلل

انداز ہوسکتی تھی اس لئے دارالعلوم کے مخصوص نصاب تعلیم میں سائنس ودیگر عصری علوم کی پیوند کاری کے مخالف تھے۔

حضرت نانوتویؒ کے اس تعلیمی تصور میں انگریزی زبان وتعلیم کا تصور اور تعلیمی تربیتی تصور بھی شامل ہے۔ جن میں اختلاف کی گنجائش تو ہے لیکن حضرت نانوتوی کے تعلیمی تصور کی ایک جامع صورت ناظرین کے سامنے آجاتی ہے۔ اللہ کرے کہ یہ کتاب امت کے لئے مفید ہو اور جناب مصنف کے لئے باعث اجر وثواب ہو۔

زین العابدین الاعظمی

۸؍محرم ۱۴۲۸ھ

مطابق ۱۸؍جنوری ۲۰۰۸ء

باسمہ سبحانہٗ

جناب مولانا عبداللہ معروفی صاحب

شعبۂ تخصص فی الحدیث، دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند احیاء اسلام اور فروغ امن عالم کی ایک عظیم تحریک کا نام ہے، اس کے بانیوں میں سرفہرست حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) جیسی عبقری وہمہ جہت شخصیت ہے۔ ایسی شخصیات تاریخ میں خال خال ہی پیدا ہوئی ہیں، احیاء اسلام اور عمومی فلاح وبہبود کے تعلق سے تحریک دارالعلوم کے دوررس اثرات وثمرات نے ثابت کردیا کہ یہ بے شک ایک عظیم تجدیدی کارنامہ تھا جو حضرت ''قاسم العلوم والخیرات'' کے ہاتھوں انجام پایا۔

جن حالات میں دارالعلوم کی بنیاد ڈالی گئی وہ مسلمانان ہند کے لئے خصوصاً اور باشندگان ہند کے لئے عموماً انتہائی نازک دنا گفتہ بہ حالات تھے، نہ صرف مسلمان بلکہ ہندوستان کا عام شہری یاس وقنوطیت کا شکار اور احساس غلامی سے نڈھال تھے، اور یہ یقین ہو چکا تھا کہ نکبت وذلت اسکا ہمیشہ کے لئے مقدر بن چکا ہے، تحریک دارالعلوم امید کی ایک کرن کے طور پر نمودار ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پورے ہندوستاں بلکہ اس کے بھی آگے کی فضا ایسی منور کردی کہ ہر شخص کو کامیابی کی منزل صاف نظر آنے لگی، بالآخر اس وقت کی طاغوتی طاقت کو منہ کی کھانی پڑی اور بوریا بستر لپیٹ کر سات سمندر پار بھاگنا پڑا، مسلمانوں کو بھی دینی، روحانی اور اقتصادی ترقیات حاصل ہوئیں اور ملک کی دیگر اقوام نے بھی راحت کا سانس لیا۔

آخر اس تحریک میں کونسی خوبی پنہاں تھی جو اس کامیابی کا سبب بنی، وہ کیا خطوط تھے جن پر چل کر یہ کاروان سفر نہ صرف منزل سے ہمکنار ہوا بلکہ اقوام عالم اس کی برق رفتاری، اثر خیزی وودررسی پر انگشت بدنداں تھیں؟ پیش نظر کتاب ''مولانا قاسم نانوتوی کے تعلیمی تصورات'' در

حقیقت اسی سوال کا جواب ہے۔ فاضل مولف محترم جناب ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی صاحب نے تحریک کا بڑی باریکی سے مطالعہ کیا، اسباب وعلل کا تجزیہ کرتے ہوئے بجا طور پر یہ پیغام دیا کہ آج بھی ملت اسلامیہ جو عمومی طور پر یاس وقنوطیت کی شکار ہے، مسلمانوں کی دینی، تعلیمی اور اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔ مدارس اسلامیہ اپنی افادیت کھوتے جارہے ہیں ان حالات میں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، اب بھی مسلمان اپنی عظمت رفتہ کو واپس لاسکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ حضرت نانوتوی کے تعلیمی تصورات پر عمل پیرا ہو جائیں، اور ارباب مدارس ان بھولے ہوئے تصورات کا پھر سے استحضار کریں اور انکی تکمیل پر پوری طرح لگ جائیں، فاضل مولف نے ان تصورات کی مناسب تحلیل وتجزیہ کے ساتھ یہ فکر انگیز کتاب ترتیب دی ہے جو یقیناً لائق تحسین، قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے، راقم السطور نے کتاب کا خاص باب "تعلیمی تصورات" کا مطالعہ کیا بلا تصنع عرض ہے کہ ہر عنوان، ہر پیراگراف اپنے اندر جاذبیت رکھتا ہے اور دعوت فکر وعمل دیتا ہے، جی چاہتا تھا کہ "استاذی وشاگردی کا تصور" سے ایک دو پیراگراف اس تاثراتی تحریر پر نقل کروں مگر صفحہ کی تنگ دامنی اجازت نہیں دیتی مجبوراً ناظرین کو اصل پر محمول کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ فاضل مولف کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اس تحریر سے ہم سب کو سبق لینے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

عبداللہ، معروفی
خادم طلبا، شعبۂ تخصص فی الحدیث
دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جناب مولانا نعمت اللہ صاحب

استاذ دارالعلوم دیوبند

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم، امابعد

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے اقتدار کے بعد کا ہندوستان قرآن پاک کی آیت کریمہ (اِنَّ الْمُلُوكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً افْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا اَعِزَّةَ اَهْلِهَا اَذِلَّةً) کی ہو بہو تصویر پیش کر رہا تھا، مسلمان جو صدیوں تک نہایت شان وشوکت کے ساتھ اس ملک پر حکمرانی کرتے آئے تھے۔ اب انگریز حکمرانوں کے رحم وکرم پر تھے، ان کے ظلم وستم کا شکار ہو رہے تھے، اور انکی گولیوں اور سنگینوں کا نشانہ بن رہے تھے، اس وقت مسلمانوں کے وجود کے ساتھ ان کی تہذیب، انکا تشخص اور انکا مذہب ومسلک سب کچھ خطرے میں تھا، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس ملک سے اسلامی زندگی کے آثار بالکل ہی فنا اور نیست ونابود کر دیئے جائیں گے۔

اس نازک اور پر آشوب دور میں جن لوگوں نے مسلمانوں کی قیادت سنبھالی، ان کو سہارا اور سنبھالا دیا، ان کے دین ومذہب اور علم وفن کی حفاظت کا انتظام کیا، ان میں سب سے روشن اور نمایاں نام حضرت قاسم العلوم والخیرات حجۃ السلام امام الکلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا ہے۔ مسلم کے اقتدار کے ختم ہونے کے بعد جو ہندوستان وجود میں آیا ہے، اسکا کوئی مسلمان فرد ایسا نہیں ہے جس کی گردن پر حضرت نانوتویؒ کا احسان نہ ہو، مولانا نانوتوی نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کے میدان کارزار میں شمشیر بکف ہوکر انگریزوں کے ساتھ جہاد کیا، اور شجاعت و بہادری کے بھرپور جوہر دکھائے لیکن جب انگریز غالب آگئے، اور مسلمانوں کی رہی سہی عسکری قوت کا خاتمہ ہوگیا، تو ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس ملک میں دین اسلام، اسلامی تہذیب وتمدن، اور مسلمانوں کے دینی ومذہبی تشخص کو بچانے کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے، اور کس

طرح کا اقدام ہونا چاہیئے، اس فکر کا نتیجہ یہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ ملک کے طول وعرض میں دینی واسلامی تعلیم کے مراکز قائم کیے جائیں، اور مدارس کا جال پھیلا دیا جائے، صرف یہی ایک طریقہ اور راستہ ہے جس کو اختیار کر کے اس ملک میں مذہب اسلام کی حفاظت کی جاسکتی ہے، اور اس فکر وخیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اپنے چند رفقاء کو ساتھ لیکر دارالعلوم دیوبند کا سنگ بنیاد رکھا۔

ضرورت ہے کہ حضرت نانوتوی کے علمی اور عملی کارناموں کو زیادہ سے زیادہ روشن اور نمایاں کیا جائے، اور ہماری نئی پود جو اپنی اور اپنے اسلاف کی تاریخ سے نابلد ہوتی جارہی ہے ان کو ان کارناموں سے واقف اور متعارف کرایا جائے، حضرت نانوتوی کی زندگی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن مزید لکھنے اور کام کرنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مقام مسرت ہے کہ جناب ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی صاحب نے "مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تعلیمی تصورات" تصنیف کر کے حضرت نانوتویؒ کے علمی وعملی کارناموں کو ایک نئے انداز اور نئے زاویے سے منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے، انکی یہ کوشش لائق ستائش اور قابل قدر ہے، انھوں نے اس میں حضرت نانوتوی کی حیات وخدمات اور افکار ونظریات کو اچھے انداز سے مرتب کر کے پیش کیا ہے، اللہ سے دعاء ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اس کاوش کو شرف قبول عطاء فرمائے اور عوام وخواص دونوں کے لئے مفید اور نافع بنائے۔ آمین۔

مولانا نعمت اللہ

خادم تدریس دارالعلوم دیوبند

ابتدائیہ

لہو دے کر بہار جانفزا ان کو بنایا تھا
وہی موسم ہمارے حق میں جوسفاک تھے بابا

عام اصطلاح میں علم کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں ایک روحانی یا اخلاقی اور دوسری جدید یا عصری۔ روحانی یا اخلاقی تعلیم سے مراد وہ دینی یا مذہبی تعلیم ہوتی ہے جو عموماً ہمارے دینی مدارس میں دی جاتی ہے اور جس کا اصل سرچشمہ الہامی تعلیم ہوتی ہے جس میں قرآن وسنت، تفاسیر وفقہ اور وہ تمام شرعی موضوعات شامل ہوتے ہیں جو ہماری مذہبی زندگی میں کام آتے ہیں لہذا ہمارے دینی مدارس میں اسی تعلیم کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ جبکہ عصری یا جدید تعلیم سے مراد ایسی مروجہ سیکولر تعلیم ہوتی ہے جو عصری تعلیم گاہوں جیسے اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں رائج ہوتی ہیں جس میں آرٹس، کامرس، سائنس، ٹکنالوجی اور دیگر اسٹریم اور ان کے مضامین وموضوعات کی تعلیم شامل ہوتی ہے۔

انیسوی صدی عیسوی میں ہندوستان سے مکمل طور پر مغلیہ سلطنت کا خاتمہ، انگریزوں کا غاصبانہ تسلط، ہندوستانی عوام، صنعت وحرفت، تعلیم وثقافت اور دیسی والیانِ ریاست کے ساتھ انگریزوں کا ناروا سلوک، غربت، افلاس، جہالت، دقیانوسیت اور سرکار وسرکاری عملے کی لوٹ گھسوٹ کے خلاف ۱۸۵۷ء کی عوامی بغاوت اور اس بغاوت کا ہندوستانی مسلمانوں سے بہیمانہ انتقام۔ عام لوگوں کے قتل وپھانسی، علماء اور اہل علم ودانش کا خاتمہ، مسلم تعلیمی اداروں کی تباہی وبربادی اور مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی زبوں حالی، احساسِ محرومی ومایوسی، سیاسی غلامی اور انگریزی تعلیمی پالیسی کے در پردہ اسلامی تہذیب وثقافت پر مغربی تعلیم وتمدن کی یلغار اور اس مغربی تعلیمی وتہذیبی یلغار سے اسلامی شناخت اور تشخص کے خاتمے کا خوف۔ ہندوستانی مسلمانوں کی بے بسی، لاچاری اور حالات سے خوف زدہ ہونے کے سبب ان میں پیدا ہونے والی بے حوصلگی اور عدم تحفظ کے احساس کے نتیجہ میں ذہنی وفکری فرسودگی میں اضافہ۔ غلط رسومات وتوہمات کا رواج اور قائدانہ فقدان اور اسی قسم کے دوسرے عوامل سے ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار میں اصلاح

کی غرض سے انیسوی صدی کے نصف اواخر میں ۱۸۵۷ء کے حالات کے پس منظر میں دوقسم کی تعلیمی تحریکوں کا آغاز ہوا جن سے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں میں ہمہ جہت اثرات مرتب ہوئے۔ ایک کا نقطۂ آغاز قیام دارالعلوم دیوبند تحریک دیوبند و قیام مدارس سے ہوتا ہے جس کے اصلی روح رواں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے تو دوسرے کا نقطۂ آغاز علی گڈھ کالج اور تحریک علی گڈھ سے ہوتا ہے جس کے میر کارواں سرسید احمد خاں تھے۔

تحریک دیوبند و قیام مدارس کے علمبردار زیادہ تر علماء تھے جن کے پیش نظر ہندوستان کے غریب اور مفلوک الحال تھے جن میں نہ تو تعلیم کا رواج تھا نہ ہی ان کی زبوں حالی اور غربت و افلاس کے خاتمے کی کوئی سبیل دکھائی دیتی تھی۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جو اپنے دور کے معروف عالم دین تھے اور جن کا تعلق بطور خاص عوام و جمہور سے تھا انھوں نے ہندوستان میں کتاب و سنت کے احیاء کے لئے غریب و نادار مسلمانوں کی مفت تعلیم کا بیڑا اٹھایا تاکہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی اسلام دشمنی اور عیسائی پادریوں کی بڑھتی ہوئی اسلام مخالف ریشہ دوانیوں، عیسائیت کے بڑھتے اثرات اور حکومت وقت کے اشاروں پر آریہ سماجیوں، سناتن دھرمیوں اور شدھی سنگھٹنوں اور مغربی تعلیم و ثقافت کی یلغار سے ہندوستانی مسلمانوں اور اسلام کو صرف بچایا جا سکے بلکہ ایجنٹوں کی مدد سے ہندوستان میں اندلس و اسپین کی طرح اسلامی تشخص اور ثقافت و تہذیب کو نیست و نابود کر دینے کے اپنے ناپاک منصوبوں کی تکمیل میں کبھی بھی کامیاب نہ ہو سکیں۔

تحریک علی گڑھ کے علمبردار علماء اور دانشور دونوں تھے۔ ان کا بنیادی مقصد مسلمانوں کے متوسط طبقے کی معاشی زبوں حالی کا خاتمہ تھا جس کے لئے جدید انگریزی کو ذریعہ بنا کر اور اسکے حصول سے انگریزی حکومت میں ملازمت اور دوسرے پیشہ ورانہ تعلیم کے ذریعہ معاشی پسماندگی کی اصلاح کر کے ہندوستانی مسلمانوں کو، معاشی، تعلیمی اور معاشرتی حالت میں بہتری لا کر انھیں ہندوستان میں دوبارہ باوقار اور باعزت زندگی سے ہمکنار کرنا تھا جو ۱۸۵۷ء کی عوامی بغاوت میں یکسر تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ چنانچہ سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک علی گڈھ کے توسط سے جدید تعلیمی اداروں کے قیام پر زور دیا گیا تاکہ ہندوستانی مسلمان انیسوی صدی کے بدلتے حالات میں جدید تعلیم سے بہرور ہو کر مستقبل میں بہتر اور باوقار زندگی کے امکانات سے فائدہ اٹھا سکیں

کیوں کہ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کا خیال تھا کہ اب انگریز ہندوستان سے جانے والے نہیں ہیں لہٰذا ان سے مفاہمت کی حکمت عملی اپنا کر تعلیمی اعتبار سے خود کفیل بننے کی سعی کی جائے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ معاشی زبوں حالی کے خاتمہ اور استحکام سے دیگر تمام قسم کی زبوں حالیوں کا سد باب کیا جا سکے گا۔ انھوں نے اپنی دور بین نگاہوں اور عالمی وملکی حالات کے بدلتے منظرنامے سے اس بات کا بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ ہندوستان میں اب پھر مسلمانوں کو حکمرانی ہاتھ آنے والی نہیں ہے اور ہندوستان میں دیر یا بہ جلد کوئی نظام لاگو بھی ہوگا تو وہ جمہوری ہوگا اور جمہوریت میں اکثریت حکمراں ہوگی اور اقلیت محض اس کی دست نگر ہوگی ایسی حالت میں اگر کوئی چیز اقلیت کو برابری کا درجہ دلا سکتی ہے یا اکثریت پر بھاری پڑسکتی ہے تو وہ تعلیمی ترقی ہی ہوسکتی ہے چنانچہ انھیں اس بات کی فکر ستائے جا رہی تھی کہ ہندوستانی مسلمان جدید عصری تعلیم سے آراستہ ہوکر آنے والی ترقیاتی دوڑ میں آگے نکلنے کو ترجیح دیں تا کہ ہندوستانی پھر سے باعزت اور باوقار زندگی سے ہمکنار ہوسکیں چنانچہ انھیں مقاصد کے تحت انھوں نے علی گڑھ کالج کھولا اور اس کو نمونہ بنا کر جدید عصری تعلیم کے فروغ کی کوششیں کیں جس سے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جدید عصری تعلیم کی طرف متوجہ ہوگیا۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور سرسید احمد خاں دونوں ہی انیسویں صدی کی اہم ترین مسلم عبقری شخصیات میں سے تھے دونوں ہی مسلمانوں کی اصلاح وفلاح کیلئے خلوص دل سے فکر مند تھے اور اپنے اپنے طور پر دونوں نے ہی اہم ترین قومی وملی فلاح واصلاح کے کارنامے انجام دیئے چنانچہ دونوں کے ہی سوانح وشخصیات اور قومی، ملی وتعلیمی وتہذیبی کارناموں پر بہت کچھ لکھا بھی جا چکا ہے۔ خصوصاً سرسید احمد خاں کی فکر ان کی تصانیف، ان کی تعلیمی وادبی تحریک، علی گڑھ کالج ان کے نظریہ تعلیم، مقاصد تعلیم، نظام تعلیم اور تصورات تعلیم پر بہت سے تصنیفی وتحقیقی کام کئے جا چکے ہیں۔ اسی طرح مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی حیات وشخصیت اور ان کے دیگر مذہبی اور دینی وملی کارناموں پر بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی بھی اسکا سلسلہ جاری ہے لیکن ان کے تعلیمی افکار وتصورات پر کم ہی قلم اٹھایا گیا ہے چنانچہ مئی ۲۰۰۳ء میں استاذ الحاج ابوبکر آثر انصاری مرحوم نے راقم کو اس جانب متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی قیام مدارس کی تحریک

اوران کے تعلیمی افکاروخیالات یا تصورات پر تحقیقی انداز سے قلم اٹھانے کی ضرورت ہے میں خود اس موضوع پر باقاعدہ تصنیفی وتحقیقی کام کرنا چاہتا تھا مگر مسلسل خرابی صحت اور روز بروز بڑھتے صنعت کی وجہ سے شاید میں یہ کام نہ کرسکوں۔نسیم تم اس کام کو کر سکتے ہو۔" چنانچہ ان کی حسب منشا جنوری ۲۰۰۴ء میں راقم نے ایک رف ان کے سامنے پیش کیا جس میں انھوں نے اپنے قیمتی مشوروں سے بعض ترمیم واضافے بھی کروائے میں نے کام بھی شروع کردیا مگر ابھی ان کی حیات وشخصیت سے متعلق پہلا باب ہی تحریر کیا تھا کہ بعض دیگر مصروفیات کے سبب کام التواء میں پڑ گیا نگران کی یاددہانی برابر جاری رہی دوبارہ کام کی شروعات کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ۷/جنوری ۲۰۰۵ء کو وہ خود ہی اس دنیائے فانی سے رحلت فرماگئے (اِنــا لِلّٰـــہ وانــا الیـہ راجعـون)ان کے انتقال کے بعد انکے بتائے ہوئے کاموں کی طرف توجہ دی چنانچہ "مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تعلیمی تصورات" کے نام سے یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تعلیمی تصورات" کل پانچ ابواب پر مشتمل ہے جو درج ذیل ہیں۔

باب ۱۔حیات وشخصیت، باب ۲۔ نگارشات وتالیفات، باب ۳۔ عہدوماحول، باب ۴۔تحریک دیوبند، باب ۵۔ تعلیمی تصورات۔اس کتاب میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی سوانح و شخصیت انکی تحریکی ،تدریسی، تصنیفی، تالیفی اور عملی کارناموں ان کے تعلیمی افکاروتصورات جیسے موضوعات پر اپنی بساط بھر تحقیقی انداز میں مجھ سے جو کچھ ممکن ہوسکا ہے قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے میں اپنی اس کوشش وکاوش میں کہاں تک کامیاب ہوسکا ہوں اس کا فیصلہ تو اہل علم اور صاحب نظر قارئین ہی کرسکتے ہیں۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں ان حضرات کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے اس کتاب کی تکمیل میں میرے ساتھ ہر طرح کا تعاون فرمایا۔لہٰذا سب سے پہلے میں استاذ الحاج ابوبکر اثر انصاری کا شکر گذار اور ان کے لئے دعاء گو ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کے لئے تحریک دلائی۔میرے ابتدائی خاکے کو پسند فرماکر میری حوصلہ افزائی کی جس سے اس کام کی تکمیل ممکن

ہوسکی ہے۔ میں اللہ رب العزت سے دست بدعاء ہوں کہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطاء فرمائے (آمین) میں مولانا ارشاد احمد قاسمی (المعارف دارالمطالعہ، پورہ معروف) کا بھی بطور خاص شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے بعض حوالہ جاتی کتابوں کی فراہمی میں پورے خلوص ودلچسپی کے ساتھ تعاون فرمایا۔ اس کے علاوہ جناب منشی نیاز احمد مفتاحی، مولوی شمشاد احمد مفتاحی اور ظہیر حسن ظہیر وغیرہ کا بھی تہ دل سے شکرگذار ہوں کیونکہ مذکورہ حضرات کے تعاون سے ہی یہ کتاب اشاعت پذیر ہوسکی ہے۔

باب اوّل

حیات و شخصیت

☆ حسب ونسب اور ولادت
☆ تعلیم وتربیت
☆ عربک کالج دہلی میں
☆ فراغت تعلیم کے بعد
☆ ملازمت
☆ حواشی بخاری شریف
☆ خواب اور خواب کی تعبیر
☆ نامور شاگردان
☆ سادگی وخاکساری
☆ نکاح وشادی
☆ سخاوت ومہمان نوازی
☆ آغاز جہاد آزادی
☆ وارنٹ اور گرفتاری
☆ چھتہ مسجد کا محاصرہ
☆ گرفتاری میں ناکامی کے اسباب
☆ عام معافی کا اعلان
☆ سفر حج
☆ رفیق سفر حج
☆ تصحیح کتب
☆ قیام دار العلوم کا خیال
☆ درس وتدریس کا مشغلہ
☆ زبان پیر ومرشد
☆ نبی کریم سے محبت وعقیدت
☆ دوسرا اور تیسرا سفر حج
☆ آخری ایام زندگی
☆ علاج ومعالجہ
☆ وفات وتدفین
☆ مرثیے اور تعزیتی تحریریں
☆ اولاد واحفاد
☆ گفتار وکردار کی یکسانیت

حیات وشخصیت

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اپنے عہد کی تاریخ ساز شخصیت تھے۔آپ نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو ہندوستان میں مسلمانوں کی صدیوں پرانی مغلیہ سلطنت اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔مغلیہ حکمرانوں کی سیاسی بے عملی، باہری حملوں اور انگریزوں کی عیارانہ اور مکارانہ چالوں کی جکڑ بندیوں نے مغل بادشاہ کو کٹھ پتلی بنا دیا تھا۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ کی ناکامی اور ۱۷۶۵ء کے کلائیو اور شاہ عالم معاہدہ کی رو سے مغل بادشاہ کے ہاتھوں سے حکمرانی اور اقتدار چھن چکا تھا اور مغل بادشاہ محض انگریزوں کا وظیفہ خوار بن کر رہ گیا تھا اور ملک بادشاہ سلامت کا حکم کمپنی بہادر کا چلتا تھا۔ ہندوستانی مسلمان جو صدیوں سے اس ملک کے حکمراں تھے ذلیل وخوار ہو کر رہ گئے تھے ان کی سیاسی بساط الٹ چکی تھی اور تعلیمی، تہذیبی اور معاشی زبوں حالی کا شکار تھے ان حالات میں مولانا قاسم نانوتویؒ کی پیدائش ہوئی اور شخصیت کی تعمیر وتشکیل ہوئی۔

<u>حسب ونسب اور ولادت</u>:- حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جن کا تاریخی نام خورشید حسین تھا۔ نانوتہ ضلع سہارن پور کے ایک معزز صدیقی خاندان میں ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے ان کی تاریخ پیدائش اور ماہِ پیدائش میں کافی اختلاف ہے مگر سن پیدائش میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔آپ کے والد شیخ اسد علی صدیقی اور آپ کے دادا شیخ غلام شاہ تھے۔آپ کے والد شیخ اسد علی صدیقی اگرچہ باقاعدہ عالم وفاضل تو نہیں تھے مگر اپنے زمانے کی مروجہ تعلیم کے لحاظ سے کافی پڑھے لکھے تھے کیونکہ اس زمانہ میں فارسی عدالتی اور دفتری زبان تھی اور فارسی کی تعلیم شاہنامہ فردوسی تک تکمیل سمجھی جاتی تھی اور اتنی تعلیم تھی جو اس وقت سرکاری ملازمت کے لئے اہل سمجھی جاتی تھی پھر بھی آپ نے ملازمت نہ کر کے زراعت کا پیشہ اختیار کرنے اور کاشتکاری کو ذریعہ معاش

بنانے کو ترجیح دی۔

آپ کے دادا شیخ غلام شاہ اگرچہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھے مگر اپنے دور کے اہم بزرگوں میں شمار کیے جاتے تھے اور خواب کی تعبیر بتانے میں خاص مہارت رکھتے تھے اس کے علاوہ اپنے دور کے صاحب کمال بزرگوں اور درویشوں کی خدمت گذاری میں بھی کافی شہرت رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ سہارنپور کے اپنے وقت کے نامور وکیل شیخ وجیہہ الدین کی صاحبزادی تھیں۔ آپ کے نانا کی وکالت خوب چلتی تھی اس لئے آپ کا ننیہال کافی خوشحال تھا۔ آپ کے نانا شیخ وجیہہ الدین ماہر قانون داں ہونے کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور اردو، فارسی میں شعر گوئی بھی کرتے تھے۔ شیخ وجیہہ الدین کا سلسلۂ خاندان بھی آگے چل کر نانوتہ کے اسی صدیقی خاندان سے مل جاتا ہے جس خاندان سے حضرت نانوتوی کا تعلق تھا اور دونوں خاندان یعنی ددیہال اور ننیہال کے مورث اعلیٰ ایک ہی ہیں مولوی محمد ہاشم اور سلسلۂ نسب چوالیس (۴۴) واسطوں سے قاسم ابن محمد بن ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مورث اعلیٰ مولوی محمد ہاشم بلخ سے ہندوستان آئے تھے اور اپنی صلاحیت و قابلیت کے سبب عہد شاہ جہانی میں مغل دربار میں باریاب ہو کر سرکاری عہدہ و منصب سے سرفراز ہوئے تھے۔ قصبہ نانوتہ کی جاگیر شاہ جہاں بادشاہ نے آپ کے مورث اعلیٰ محمد ہاشم کو عنایت فرمائی تھی اور اسی سبب سے آپ کے مورث اعلیٰ ضلع سہارنپور کے اس قصبہ نانوتہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شاہ جہاں نے قصبہ نانوتہ کی جاگیر آپ کے مورث اعلیٰ مولوی محمد ہاشم کو عطاء کی تھی وہ چند دیہات اور مکانات پر مشتمل تھی اور تغیر زمانہ کے ہاتھوں وہ بھی ہاتھ سے نکل گئی تھی جس سے آپ کے خاندان کے پاس جاگیر کے نام پر کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔

آپ کے مورث اعلیٰ عہد شاہ جہانی میں مغلیہ دربار میں مقرب شاہی سے سرفراز تھے

پھر بھی آپ کے والد اور دادا میں نہ تو جاگیردارانہ رعب ودبدبہ تھا اور نہ ہی کسی طرح کا احساس برتری۔ سادگی منکسر المزاجی اور نرم دلی آپ کا خاص وصف تھا اور یہ خاص وصف بھی آپ کو وراثت میں ملا تھا کیوں کہ انسان بہت سی خوبیاں اپنی وراثت میں پاتا ہے جو خون کے ذرات اور جسمانی خلیوں میں اپنے وراثتی اثرات لیکر آتا ہے۔ آپ کا حسب نامہ مختصراً یہ ہیکہ محمد قاسم بن شیخ اسد علی بن شیخ غلام بخش دین شیخ محمد بخش بن شیخ محمد علاء الدین بن شیخ ابوالفتح بن شیخ محمد مفتی بن شیخ عبدالسمیع بن محمد ہاشم۔

شجرہ نسب مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

مولوی محمد ہاشم

شیخ عبدالسمیع

شیخ محمد مفتی

شیخ ابوالفتح

شیخ محمد عاقل | شیخ علاء الدین | حکیم عبیداللہ

شیخ محمد بخش

شیخ غلام بخش

شیخ اسد علی

مولانا محمد قاسم نانوتوی
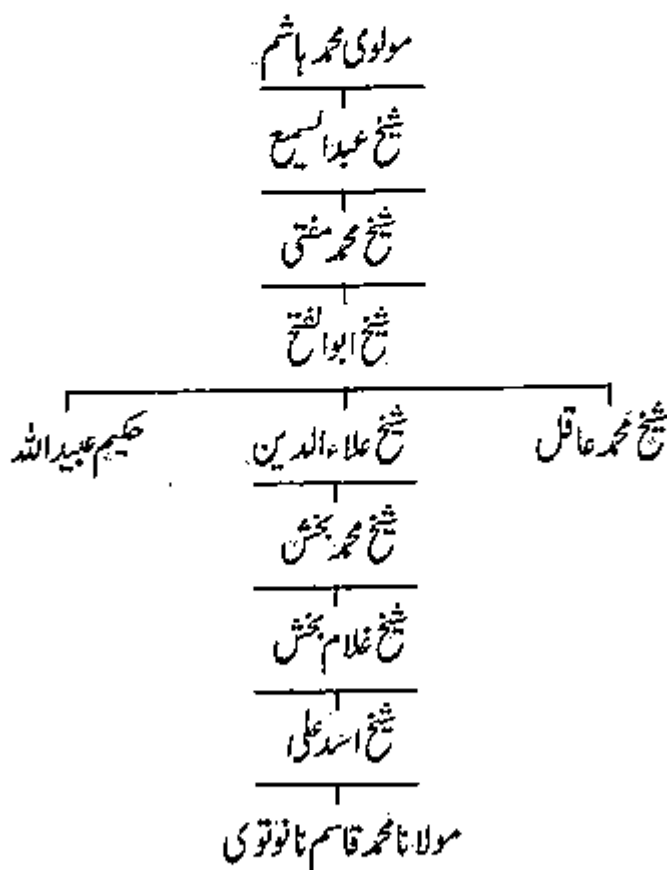
تعلیم وتربیت:- مولانا محمد قاسم نانوتویؒ عہد طفولیت سے کافی ذہین، طباع، بلند حوصلہ، تیز صبری، جفاکش اور چست وچالاک واقع ہوئے تھے۔ مکتب میں ہمیشہ اپنے ہم سبق ساتھیوں

میں اوّل رہتے تھے اور طالب علمی کے زمانہ میں بھی اپنے ہم عمروں میں گروپ لیڈر بنے رہتے تھے۔ آپ نے قرآن شریف بہت جلد ختم کر لیا تھا اور تحریر بھی کافی خوش خط تھی۔ کھیل کود میں دلچسپی رکھتے تھے اور شعروشاعری سے بھی شغف تھا اور اکثر کھیل اور بعض واقعہ نظم کر لیا کرتے تھے گویا بچپن سے ہی موزوں اور سلیم طبع تھے۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا ننہالی رشتہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے خاندان سے ملتا تھا اور حضرت کی بہن بھی نانوتہ میں ہی بیاہی ہوئی تھیں جن سے ملنے کے لئے آپ اکثر نانوتہ آیا جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے حاجی صاحب سے جلد سازی کا کام سیکھا تھا جس سے اپنی کتابوں کی اچھی جلد سازی کر لیتے تھے۔ اس کے بعد بعض وجوہات کے سبب آپ نانوتہ سے دیوبند چلے گئے تھے۔ دیوبند میں شیخ کرامت حسین صاحب پر جہاں نہال احمد صاحب پڑھتے تھے مولانا کو انہوں نے ہی عربی پڑھائی اس کے بعد وہ اپنے ننہال چلے گئے تھے جہاں مولوی محمد نواز صاحب سہارنپوری سے فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اس کے بعد مولانا مملوک علی صاحب کے ہمراہ دہلی چلے گئے۔ مولانا نے قافیہ شروع کی اور معقول کی مشکل کتابیں میر زاہد، قاضی، صدرا، شمس بازغہ وغیرہ پڑھیں۔ حدیث کی کتابیں مولانا شاہ عبدالغنی سے پڑھیں اسی زمانہ میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت ہوئے۔

عربک کالج دہلی:۔ مولانا مملوک علی صاحب کے ہمراہ ۴ محرم الحرام ۱۲۶۰ھ مطابق جنوری ۱۸۴۴ء کو دہلی پہونچ کر اعلیٰ تعلیم کے لئے عربک کالج دہلی میں داخلہ لیا۔ مولانا مملوک علی نے ریاضی کے استاد سے بلا کر یہ کہدیا کہ ان کو ان کے حال پر رہنے دینا کسی قسم کا اعتراض نہ کرنا میں ان کو پڑھا دونگا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی سے کہا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لینا اور حساب کی مشق کر لینا

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ استاد کو اپنے شاگرد کی صلاحیت پر پورا اعتماد تھا اور مولانا مملوک علی بھی چونکہ ایک منجھے ہوئے اور تجربہ کار استاد تھے لہٰذا انھوں نے اپنے شاگرد کی صلاحیت کا اندازہ کرلیا تھا۔

عربک کالج میں داخلہ کے بعد مولانا مملوک علی نے آپ کو قافیہ پڑھانا شروع کیا۔ استاد اپنے اس شاگرد کی ذہانت و صلاحیت سے پہلے ہی واقف تھے لہٰذا انھوں نے اپنے صاحبزادے محمد یعقوب کی تعلیمی نگرانی کی ذمہ داری بھی آپ کو ہی سونپ دی اور کہا کہ تعلیمات، ابواب اور ترکیب کی پوچھتا چھ کرتے رہنا۔ مولانا محمد قاسم نے استاد کی ہدایت کے مطابق اپنے طور پر حساب کا مطالعہ کرنے لگے۔ اسی زمانہ میں منشی ذکاء اللہ صاحب کسی ریاضی کے ماسٹر کے بتائے ہوئے چند سوالات لائے جو بہت ہی مشکل تھے انھوں نے مولانا سے ان سوالوں کو پوچھا مولانا نے بلا کسی دقت کے ان سوالوں کو فوراً حل کردیا پھر کیا تھا پورے کالج کے باہر آپ کے حساب دانی کی شہرت پھیل گئی۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے جس دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی وہ اپنے دور کا مایہ ناز تعلیمی ادارہ تھا چنانچہ اس کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں میں کئی عہد ساز شخصیت پیدا ہوئیں جیسے خود مولانا محمد قاسم نانوتوی، سرسید احمد خاں، رشید احمد گنگوہی وغیرہ مولانا محمد قاسم نے اس کالج میں تقریباً پانچ سالوں تک تعلیم حاصل کی اور ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں جملہ علوم وفنون کی تکمیل کی۔ دوران تعلیم استاذ الاساتذہ مولانا مملوک علی کی آپ پر خاص توجہ اور عنایت تھی کیونکہ ہر استاد ایسے تیز طباع اور باصلاحیت شاگرد پر اپنی خاص نظر عنایت رکھتا ہے اور فخر بھی کرتا ہے اور اپنے علمی خزانے کے دروازے اس طرح کھول دیتا ہے کہ طالب علم کی تشنگی علم پوری طرح سیراب ہو جائے۔ چنانچہ دہلی

کالج میں مولانا کی استعداد و صلاحیت کا طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ میں خوب چرچا ہو گیا تھا اور ان کی ذہانت و فطانت علمی حلقوں میں گفتگو کا موضوع بن گئی تھی چنانچہ آپ کی مختلف طریقوں سے جانچ پرکھ بھی ہونے لگی اور آپ ہر آزمائش اور امتحان میں سرخرو بن ہی نکلے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی کا داخلہ اگرچہ عربی کالج میں تھا مگر اصل تعلیم مولانا مملوک علی صاحب اپنے گھر پر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ جس سال مولانا نانوتوی نے کالج میں داخلہ لیا اسی سال کالج کے نصاب میں بعض اہم تبدیلی رونما ہو گئی۔ پہلے کالج میں عربی اور انگریزی کے دو مختلف شعبے ہوا کرتے تھے۔ مگر نئی تبدیلی کی رو سے دونوں زبانوں کا مشترکہ نصاب بنا دیا گیا تھا۔ پہلے عربی کے طلبہ عربی زبان وادب کے ساتھ اسلامی علوم وفنون بھی پڑھا کرتے تھے جدید علوم ان کے نصاب میں شامل نہیں ہوتے تھے مگر اب نئے نصاب میں عربی کے طلبہ کو بھی جدید علوم حساب، جغرافیہ، جیومٹری، الجبرا، نیچرل فلسفہ، تاریخ ہند اور معاشیات وغیرہ کا پڑھنا ضروری قرار دیا گیا تھا اس لئے خالص مشرقی علوم کی تحصیل کرنے والے طلبہ کی توجہ مولانا مملوک علی صاحب کے گھر کی تعلیم کی طرف زیادہ تھی۔ مولانا نانوتوی بھی ایسے ہی طلبہ میں سے تھے انکا نام اگرچہ کالج کے باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے کالج کے رجسٹر میں چلتا تھا مگر آپ جدید علوم کے اسباق میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ بقیہ اسباق میں شریک رہتے تھے جبکہ استاذ گرامی کی ہدایت تھی کہ یہ مضامین تم خود دیکھ لو یعنی پورے نصاب کی تکمیل کا بندوبست مولانا مملوک علی نے اپنے لائق فائق شاگرد کا خود ہی کر دیا تھا۔ اس سے اس بات کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جدید علوم جو اس وقت دہلی کالج کے نصاب میں شامل تھے ان کی تکمیل کے لئے مولانا کو کسی استاد یا رہنما کی ضرورت نہیں تھی۔ اور آپ نے اپنے استاد کے اعتماد کو کسی طرح بھی ٹھیس نہیں پہونچنے دی۔ لیکن جب آخری سال کا فائنل

امتحان منعقد ہوا تو آپ نے اس میں شرکت نہیں کی جس سے لوگوں کو کافی تعجب و حیرت ہوئی کہ اتنا ذہین اور باصلاحیت طالب علم نے آخری سال کے امتحان میں شریک نہ ہو کر اپنا مستقبل تباہ و برباد کر دیا۔ اساتذہ کو یقین تھا کہ یہی طالب علم کالج ٹاپ کر کے اچھی سے اچھی نوکری پانے کا حقدار ہوگا مگر مولانا نانوتوی سے قدرت کو کچھ اور ہی کام لینے تھے چنانچہ انھوں نے اپنی اسی ناکامی کو کامیابی تصور کیا کہ انگریزی نظام تعلیم کے تحت چلنے والے تعلیمی ادارہ کی سند نہ لیکر اور سب سے اہم اور بامقصد امتحان میں شرکت نہ کر کے کالج سے اپنا نام خارج کرالیا۔ کیوں کہ آپ کی نظر میں تعلیم کو روزی کمانے کا ذریعہ تصور کرنا تعلیم کا سب پست مقصد تھا اور آپ تعلیم کے اتنے پست اور سطحی مقصد کو تعلیم اور علم و آگہی کی توہین تصور کرتے تھے کیوں کہ ان کے پیش نظر اسلام کا اعلیٰ وارفع تعلیمی تصور تھا۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے یوں تو جملہ علوم وفنون کی کتابیں استاد العصر مولانا مملوک علی سے پڑھی تھیں لیکن چند کتابیں دہلی کے دیگر علماء سے بھی پڑھی تھیں جس میں مفتی مولانا صدرالدین، شاہ اسحاق محدث دہلوی کا نام سرِفہرست ہے۔ ۱۲/ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو مولانا مملوک علی کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے شاگردوں میں کئی عہد ساز اور انقلاب آفریں شخصیات شامل تھیں۔ آج ملت کو پھر ایسے ہی اساتذہ کی ضرورت ہے جو ملت میں پوشیدہ جوہروں کو تلاش کر اور انھیں صیقل کر کے ملت کی رہنمائی کے لئے تیار کر سکیں تاکہ ملت اسلامیہ ایک بار پھر نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں سربلند وسرخ رو ہو سکے۔

فراغت تعلیم کے بعد:- مولانا محمد قاسم نانوتوی نے (۱۷) سترہ سال کی عمر میں تعلیم سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی اپنے والد حضرت مولانا مملوک علی کے انتقال

کے بعد تقریباً ایک سال دہلی میں رہے اور جب اجمیر میں ملازمت مل گئی تو دہلی سے اجمیر چلے گئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی دہلی سے نانوتہ چلے آئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد جو سب سے اہم مسئلہ تھا وہ معاش کا تھا۔ خاندان کے بیشتر حضرات تعلیم سے فراغت کے بعد ملازمت اختیار کر چکے تھے آپ نے اپنے اوپر سرکاری ملازمت کا دروازہ پہلے ہی خود سے بند کر دیا تھا جبکہ آپ کے والد شیخ اسد علی اپنے بیٹے سے یہ توقع لگائے بیٹھے تھے کہ بیٹے کی تعلیم سے فراغت کے بعد ان کے دن پھریں گے۔ کیوں کہ کاشتکاری سے گھر کی معاشی حالت کوئی بہت اچھی نہیں تھی بس کسی قدر سادگی سے گذر بسر ہو جاتا تھا حضرت نانوتوی ملازمت نہیں کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی گھر کی معاشی حالت کے سدھار کا کوئی ذہن میں تصور تھا کیوں کہ جو شخصیات ہمہ گیر ہوتی ہیں وہ کبھی اپنی نجی خواہشات کی تکمیل کے بارے میں فکر مند نہیں ہوتیں چنانچہ مولانا نانوتوی بھی اپنی فاقہ مستی میں ہی مست تھے۔ یہ دیکھکر آپ کے والد شیخ علی جھنجھلا جاتے تھے چنانچہ ایک روز اسی جھنجھلاہٹ کے عالم میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خدمت پہونچے اور کہا کہ ''بھائی! میرے تو یہی ایک بیٹا تھا۔ مجھے کیا امیدیں تھیں۔ کچھ کماتا تو ہمارا افلاس دور ہو جاتا تم نے اسے خدا جانے کیا کر دیا ہے کہ یہ نہ کچھ کماتا ہے نہ نوکری کرتا ہے۔'' (سوانح عمری از مولانا محمد یعقوب نانوتوی صفحہ ۳۳۔)

عموماً والدین اپنی اولاد سے اسی قسم کی امیدیں باندھے رہتے ہیں اسلئے شیخ اسد علی کی توقع بھی کوئی غیر متوقع نہیں تھی چنانچہ آپ کے والد محترم کی شکایت میں جو جذبہ کارفرما تھا وہ فطری تھا۔ حاجی صاحب نے شکایت بڑی توجہ سے سنی اور ہنس کر خاموش ہو گئے اور شیخ اسد علی سے فرمایا کہ ''یہ شخص ایسا ہونے والا ہے کہ سو پچاس والے سب اس کی خادمی کریں گے اور ایسی شہرت ہوگی کہ اسکا نام ہر طرف پکارا جائے گا اور تم تنگی کی شکایت کرتے ہو؟ خدائے تعالیٰ بے نوکری کے ہی اتنا دیگا کہ ان نوکروں سے بڑھتا جائیگا۔'' (سوانح عمری از مولانا محمد یعقوب نانوتوی صفحہ ۳۳)۔

ملازمت:۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کو اپنے گھریلو حالات کا بخوبی علم تھا۔ چنانچہ انھیں حالات

کے پیش نظر آپ دلی چلے گئے اور مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری جو مکہ مکرمہ سے شاہ اسحاق محدث دہلوی مہاجر مکی سے علم حدیث حاصل کر کے ہندوستان آچکے تھے اور دلی میں اپنا ذاتی مطبع احمدی قائم کر چکے تھے اور حدیث کی کتابوں کی نایابی کے تحت ان کی اشاعت کا منصوبہ رکھتے تھے اور اس منصوبہ کی تکمیل میں مصروف عمل بھی تھے چنانچہ انھیں ایک ایسے مصحح کی ضرورت تھی جو علم حدیث میں مہارت رکھتا ہو مولانا نانوتوی اسی مطبع میں بارہ روپئے ماہوار پر کام کرنے لگے۔

حواشی بخاری شریف:- مطبع احمدی کے مالک مولانا احمد علی محدث سہارنپوری صرف اپنے مطبع کے مالک ہی نہیں تھے بلکہ اپنے عہد کے مایہ ناز محدث بھی تھے۔ آپ شاہ اسحاق محدث دہلوی مہاجر مکی کے شاگرد رشید تھے آپ نے احادیث کا علم مکہ معظمہ میں اپنے استاد شاہ اسحاق محدث دہلوی سے حاصل کیا تھا۔ مدرسہ مظاہر العلوم میں حدیث کا درس بھی دیتے تھے اور مطبع کا کام بھی کرتے تھے۔ آپ نے ہندوستان میں بخاری شریف کی کمیابی کے سبب اس کی اشاعت کا منصوبہ بنایا چنانچہ اپنے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اور اساتذہ وطلباء کی سہولت کے لئے اس پر حواشی بھی تحریر کرنے کا منصوبہ شامل کرلیا۔ بخاری صحاح ستہ میں سب سے مستند کتاب تسلیم کی جاتی ہے اس میں بعض ایسی روایتیں بھی ہیں جو بظاہر احناف کے مسلک سے متصادم نظر آتی ہیں اسلئے انھوں نے ان روایتوں پر پوری گہرائی سے غور کر کے اس طرح واضح کیا کہ احناف کے مسلک اور روایت میں جو بظاہر تضاد نظر آتا ہے وہ ختم ہوگیا۔ چنانچہ مولانا احمد علی صاحب نے جو حاشیہ لکھا اس میں اپنے مذکورہ خیالات کا التزام کیا اور جس روایت سے احناف پر اعتراض ہوسکتا تھا اس کو دلائل وبراہین سے ختم کر دیا آپ نے تقریباً پچیس پارہ کا حاشیہ مکمل کرلیا تھا مگر دیگر مصروفیات کے تحت وہ کام التواء میں پڑ گیا تھا۔

حضرت مولانا نانوتوی جب مطبع سے وابستہ ہوگئے تو آپ نے ان کی صلاحیت و قابلیت کے پیش نظر بقیہ حاشیے کا کام ان کے سپرد کر دیا اور حضرت نانوتوی نے بھی اس کام کو بخوشی

قبول فرما لیا اور کام شروع کر دیا۔ جب مولانا احمد علی صاحب کے رفقاء کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے اعتراض کیا کہ اتنے اہم کام کو آپ نے ایک نوآموز لڑکے کے سپرد کر کے اچھا نہیں کیا ہے اس سے حاشیہ کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ لیکن مولانا احمد علی نے انھیں جواب دیا کہ میں نافہم نہیں ہوں اور نہ ہی میں نے بغیر سوچے سمجھے ایسا کیا ہے۔ اور پھر جب مولانا نانوتوی کا تحشیہ اپنے رفقاء کو دکھایا تو وہ مولانا محمد قاسم کی صلاحیت وکمال کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس حاشیہ کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں کوئی بات بغیر سند کے نہیں لکھی گئی ہے۔

خواب اور خواب کی تعبیر:- مولانا محمد قاسم نے اپنی زندگی میں دو اہم ترین خواب دیکھے تھے اور ان دونوں خوابوں کے آپکی شخصیت کی تعمیر میں نمایاں اثرات نظر آتے ہیں ایک خواب آپ نے بچپن میں دیکھا تھا جس کی تعبیر آپ کے استاد حضرت مولانا مملوک علی نے بتائی تھی ذیل میں دونوں خوابوں کو علیحدہ علیحدہ درج کیا جاتا ہے۔

(الف) پہلا خواب:- بچپن میں یہ خواب دیکھا تھا کہ میں اللہ جل شانہٗ کی گود میں بیٹھا ہوں آپ نے اس خواب کا ذکر اپنے دادا محترم سے فرمایا جو خواب کی تعبیر بتانے میں مہارت وشہرت رکھتے تھے۔ آپ نے اس خواب کی تعبیر یہ بتائی کہ اللہ تعالیٰ تمھیں کافی علم عطا کریگا اور تم بہت بڑے عالم ہوگے۔

(ب) دوسرا خواب:- دوسرا خواب آپ نے زمانۂ طالب علمی میں دیکھا تھا کہ میں خانۂ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور مسجد سے نکل کر ہزاروں نہریں جاری ہو رہی ہیں۔ آپ نے اس خواب کا تذکرہ اپنے استاد محترم مولانا مملوک علی سے کیا تھا تو آپ نے تعبیراً فرمایا تھا کہ تم سے علم دین کا فیض بکثرت جاری ہوگا۔

مولانا محمد قاسم نے مذکورہ بالا دونوں خوابوں کے علاوہ بھی کئی ایسے خواب دیکھے جو بعد کی زندگی میں صحیح ثابت ہوئے مگر یہ دونوں خواب ان کی زندگی میں پورے طور پر عملاً شرمندۂ تعبیر

ہوکر رہے۔ پہلے خواب کے مطابق آپ اپنے دور کے عہد ساز عالم ہوئے ایک ایسے عالم جن کا فیض علمی زمان ومکان کی حدود کو توڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاری ہوگیا اور چراغ سے چراغ جلانے والا ایسا سلسلہ قائم ہوگیا جو آج تک جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام اور اس کے تعلق سے ہزاروں مدرسوں کا قیام اور ان کے تعلیمی سلسلے سے جو کتاب وسنت اور فقہ کی اشاعت ہوئی ہے اور ہورہی ہے وہ یقیناً علم وآگہی کی نہروں کا اجراء ہے اور جن کا سرچشمہ آپ کی ذات گرامی ہی ہے۔ یہ دوسرے خواب کی تعبیر کی علامت کا نمونہ ہے۔

زبان پیرومرشد:- مولانا محمد قاسم نانوتوی کی قابلیت اور پرہیزگاری دونوں بے مثل تھیں چنانچہ آپ کے پیرومرشد حضرت امداداللہ مہاجر مکی بھی آپکی علمی قابلیت اور تقویٰ کے بڑے مداح تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ محمد قاسم جیسے لوگ پہلے زمانہ میں ہوا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو ایک لسان عطاء فرماتا ہے جیسے حضرت شمس تبریز کے لئے مولانا روم کو زبان بنادیا تھا اور میرے لئے محمد قاسم لسان عطاء ہوئے ہیں چنانچہ میرے دل میں جو کچھ آتا ہے آپ بیان فرمادیتے ہیں۔

سادگی وخاکساری:- آپ فطرتاً خوش مزاج واقع ہوئے تھے اور بااخلاق بھی۔ تنہائی پسند تھے اور خاموش طبع بھی اس لئے ہر کسی کو آپ سے بات کرنے یا کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ آپ انتہائی صابروشاکر بھی تھے۔ جب مولانا احمد علی صاحب کے مکتبہ میں کام کرتے تھے تو لوگ بطور لطیفہ کہا کرتے تھے کہ لوگ انھیں مولوی صاحب کہہ کر پکارتے تھے تو بولتے بھی نہیں تھے لیکن کوئی نام لیکر پکارتا تھا تو آپ خوش ہوتے تھے۔ تعظیم سے بہت گھبراتے تھے بے تکلفی آپ کا خاص طرۂ امتیاز تھا۔ شاگردوں اور مریدوں سے دوستوں کی طرح پیش آتے تھے۔ اپنے دور کے علماء کی وضع یعنی عمامہ اور کرتے کا بھی اہتمام نہیں کرتے تھے۔ مسئلہ کبھی نہیں بتاتے تھے اور اگر کوئی مسئلہ

پوچھتا تو کسی اور کے حوالے کر دیتے تھے۔ شروع شروع میں امامت سے بہت گھبراتے تھے لیکن بعد میں اپنے وطن میں نماز پڑھانے لگے تھے۔ وعظ بھی نہیں کہتے تھے مگر وعظ کی محفلوں میں بیٹھ کر دوسروں کے سنا کرتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے۔ مولوی مظفر حسین کاندھلوی جو اس زمانے میں قدماء کے نمونہ تھے پہلی مرتبہ آپ سے وعظ کہلوایا تھا اور خود بھی بیٹھ کر سنا تھا اور خوش ہوئے تھے۔

نکاح وشادی:- آپ کے والد بزرگوار آپ کی طرف سے کافی فکر مند رہا کرتے تھے انھیں اس بات کی شکایت تھی کہ نہ کوئی ذریعہ معاش اختیار کرتے ہیں اور نہ ہی نکاح کرتے ہیں چنانچہ آپ نے آپ کے پیرومرشد سے اس بات کے لئے بھی کہا۔ چنانچہ پیرومرشد نے نکاح کے لئے حکم فرمایا تو آپ راضی ہو گئے مگر شرط یہ رکھی کہ میں جس حالات میں رہوں گا بیوی بھی رہیگی چاہے غربت ہو یا تنگ دستی۔ سسرال والوں نے یہ شرط منظور فرمالی اور شیخ کرامت حسین صاحب جو دیوبند کے مشہور رئیس تھے ان کی لڑکی سے آپکا نکاح ہو گیا۔ اس وقت آپ تصحیح کا کام کرتے تھے اور صرف پانچ روپئے ماہانہ تنخواہ تھی۔

سخاوت ومہمان نوازی:- مزاج میں سخاوت اور مہمان نوازی فطرتاً واقع ہوئی تھی۔ کل ماہانہ آمدنی پانچ روپئے تھی۔ بھلا اس مختصر آمدنی میں کیا بچا پاتے اور جب بھی گھر آتے مہمانوں کی آمد شروع ہو جاتی۔ تنگ دستی کے سبب بالآخر بیوی کی اجازت سے اس کا زیور تک فروخت کرنا پڑا تھا۔ بیوی بھی انتہائی شوہر پرست اور طابع دار خاتون تھیں۔ آپ کے والدین کی خدمت خوب کرتی تھیں اس کے بعد ہی شوہر کی خدمت پر توجہ دیتی تھیں لہٰذا آپ کے والدین اور آپ بھی ان سے خوش رہا کرتے تھے۔ تنگ دستی عسرت میں بھی کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی تھیں چنانچہ جب کشادگی ہوئی تو جو کچھ بھی ہوتا تھا بیوی کو لا کر دیدیا کرتے تھے اور بیوی بھی ماشاءاللہ خوب کشادہ دست تھیں اور مولانا کا جب بھی کوئی مہمان آتا تھا فوراً کھانا پکا کر کھلاتی تھیں۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہوا

کہ کوئی مہمان آیا ہو اور بغیر کھانا کھائے رہا ہو مولانا کہا کرتے تھے کہ ہماری سخاوت تو احمد کی والدہ کی بدولت ہے۔

آغاز جہاد آزادی:- مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی انگریزوں کے بڑھتے تسلط، ظلم وزیادتی اور ہندوستانی صنعت وتجارت کو تباہ وبرباد کرنے کی ان کی پالیسی۔ عیسائی، پادریوں کی اسلام مخالف مہم اور مذہب اسلام کو نیست نابود کردینے کی پادریوں اور انگریز حکمرانوں کی درپردہ سازش۔ ہندوستانی ادب وثقافت کی تضحیک اور مغربی تہذیب وتعلیم کی برتری کا اظہار اور انھیں حکمرانی کی بدولت زبردستی ہندوستانیوں پر تھوپنے کی کوششیں جس کی سب سے پہلے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے مخالفت کرتے ہوئے انکے تدارک کی کوششیں شروع کی تھیں اور ایک انقلابی جماعت کی داغ بیل ڈالی تھی اور جو ہندوستانی قومی بیداری کی تاریخ میں جماعت ولی الٰہی کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔ اس جماعت کے تیسرے امام حضرت شاہ عبدالغنیؒ تھے جو ۱۸۴۶ء میں انتقال فرما گئے تھے ان کے انتقال کے بعد حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی کو اس جماعت کا چوتھا امام منتخب کیا گیا تھا جو مولانا نانوتوی کے پیرومرشد بھی تھے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی کی عمر ابھی پچیس سال کی نوجوانی کی عمر تھی اور آپ دہلی میں تصحیح کے کام سے وابستہ تھے کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی شروع ہوگئی تھی کیونکہ میرٹھ چھاؤنی کے ہندوستانی فوجیوں نے سور اور گائے کی چربی سے لگے کارتوس کو منہ سے کھولنے سے انکار کردیا تھا جس سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی شروعات ہوگئی تھی۔ ہندوستانی فوجیوں نے اپنے انگریز افسروں کی بات ماننے سے انکار کردیا تھا جس سے ان سپاہیوں کا کورٹ مارشل کیا گیا اور انھیں سزا دی گئی جس سے دوسرے فوجیوں کے دلوں میں انگریزوں کی نفرت کے جذبات بھڑک اٹھے انھوں نے بیرک میں موجود سارے انگریز افسروں کو اپنی گولیوں سے بھون ڈالا یہ واقعہ ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء میں رونما ہوا اور میرٹھ چھاؤنی انگریز افسروں سے خالی ہوگئی۔ فوجی مارے جوش میں دہلی

کے لئے روانہ ہو گئے اور بہادر شاہ ظفر کو اپنا بادشاہ بنا کر دہلی میں وہ تباہی مچادی کہ کسی بھی انگریز کی جان محفوظ نہیں رہ گئی تھی۔

فوجیوں کی اس بغاوت کی خبر جب ملک کے دوسرے حصوں میں پہونچی تو ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی نفرت کی دبی ہوئی چنگاری شعلۂ جوالہ بن کر بھڑکنے لگی اور پورے ملک میں ہر طرف بغاوت پھوٹ پڑی۔ بیرک پور، میرٹھ اور دہلی کے بعد ہندوستان کے مختلف مقامات پر جنگ آزادی چھڑ گئی اور وہاں کے مقامی رہنماؤں نے وہاں کی کمان سنبھال لی۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے اپنے رفقاء وشریک کار مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا عبدالغنی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا شیخ محمد تھانوی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی سے جہاد حریت کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کیا مولانا شیخ محمد تھانوی نے بے سروسامانی کے سبب شرکت نہ کرنے کی رائے دی لیکن مولانا محمد قاسم نانوتوی نے کہا کہ کیا ہم اصحاب بدر سے بھی زیادہ بے سروسامان ہیں؟ حضرت امداد اللہ مہاجر مکی نے طرفین کی باتیں سنیں اور فرمایا لہ الحمدللہ انشراح ہوگیا۔ جہاد کی تیاری شروع ہوگئی۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے امامت قبول فرمائی مولانا محمد قاسم نانوتوی سپہ سالار مقرر ہوئے اور مولانا رشید احمد گنگوہی قاضی بنائے گئے اور تھانہ بھون دارالسلام قرار پایا۔

مئی ۱۸۵۷ء کی اس پہلی جنگ آزادی سے قبل ہی انگریز دہلی پر قابض ہو چکے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت محض نام کی رہ گئی تھی اور وہ محض شطرنجی بادشاہ کا رول ادا کررہے تھے اور انگریز ریزیڈنٹ کے محتاج محض بنادیئے گئے تھے اور ایسے برائے نام بادشاہ کے سبب ہندوستان کو دارالسلام نہیں کہا جاسکتا تھا چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ پہلے ہی دے چکے تھے۔ سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسماعیل شہید تحریک جہاد وحریت کی پہلے ہی بنیاد ڈال چکے تھے اس پس منظر میں انگریزی حکومت ختم کرنے کی امکانی کوشش شرعی اعتبار سے بھی مستحسن تھی اور اگر انگریزی اقتدار کی جڑیں کافی مضبوط و مستحکم تھیں تو بھی یہ کوشش وقربانی

رائیگاں جانے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر کے تحت جہاد کی شروعات کر دی گئی تھی۔ تھانہ بھون کو مرکز بنایا گیا۔ قاضی عنایت اللہ خاں اور ان کے چھوٹے بھائی عبدالرحیم ان کے ساتھ سہارنپور پہونچے اور سرائے میں قیام کیا۔ ایک بنئے نے مخبری کر دی کہ تھانہ بھون کا رئیس بھی حکومت کا باغی ہو گیا ہے اور اس کا بھائی دہلی سے کمک بھیجنے کے لئے ہاتھی خریدنے آیا ہے اور کئی دنوں سے سرائے میں قیام پذیر ہے نتیجہ کے طور پر عبدالرحیم اور ان کے ساتھی گرفتاری کر لئے گئے اور جیل بھیج دیئے گئے اور اگلے ہی دن انہیں پھانسی کی سزا دیدی گئی۔ جب قاضی عنایت اللہ صاحب کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو ان کا جوش شہادت موجزن ہو گیا اسی دوران خبر ملی کہ چند فوجی سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوس کی بہنگیاں لدوائے سہارنپور سے کرانہ کی طرف جارہے ہیں قاضی صاحب بلا کسی تاخیر کے مع اپنے رفقاء کے موقع پر پہونچ گئے اور فوجی سواروں پر حملہ کر کے میگزینیں چھین لیں۔ ایک سوار اس لڑائی میں زخمی ہو کر جنگل کی طرف بھاگ گیا مگر کچھ ہی دور گیا تھا کہ بدحواسی کے عالم میں گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس واقعہ کی خبر جب مظفر نگر پہونچی تو حاکم ضلع نے تھانہ بھون پر فوج کشی کا حکم دیدیا اور قاضی عنایت علی خاں اور ان کے ساتھیوں نے انتہائی بہادری سے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا۔ اس معرکہ میں حاجی امداداللہ، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حافظ ضامن علی بہ نفس نفیس شریک ہوئے تھے۔ بندوقچیوں نے اپنی بندوقوں سے جی بھر کے گولیاں چلائیں مگر بہادروں نے ایسی بے خوفی کا مظاہرہ کیا کہ انگریز بندوقچیوں کے دانت کھٹے ہو گئے۔ حافظ ضامن علی زیر ناف گولی لگی اور موقع پر ہی شہید ہو گئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی اچانک سر پکڑ کر بیٹھ گئے سب نے یہ یقین کر لیا کہ کنپٹی پر لگی ہے اور دماغ کو چھیدتی ہوئی پار ہو گئی ہے۔ حاجی امداداللہ فوراً لپکے اور عمامہ اتار کر دیکھا تو کہیں کچھ نہیں تھا۔ تحصیل کے متعدد اہل کار اس جنگ میں کام آ گئے تھے اور خزانہ پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا تھا۔

تھانہ بھون کا انگریز فوج نے محاصرہ کر لیا اور مشرقی جانب سے گولی باری شروع کر دی

تھی اور دن نکلتے ہی فوج قصبہ میں داخل ہوگئی اور چاروں جانب قتل وغارت گری کا بازار گرم کر دیا اور رات ہونے سے پہلے ہی شہر پناہ کے چاروں دروازے کھولدیے گئے اور مکانات کو آگ لگا دی گئی اور جی بھر کے لوٹ مار کی گئی اور اگلا دن شروع ہونے سے قبل ہی پورا قصبہ تھانہ بھون پوری طرح تباہ وبرباد ہو چکا تھا۔ ادھر دارالحکومت دہلی میں گھمسان کی جنگ جاری تھی اور جب انگریزوں کا دوبارہ دہلی پر قبضہ ہوگیا تو اطراف وجوانب کے باغیوں کی تلاش اور سرکوبی کی مہم شروع ہوئی۔ اس ملک میں ہندوستانی مسلمان بری طرح تباہ وبرباد ہو گئے تھے۔ امیر غریب اور غریب غربت کی سطح سے نیچے آگئے تھے۔ سیاسی زبوں حالی تو پہلے ہی ہو چکی تھی اب معاشی زبوں حالی نے اپنا دامن پھیلا دیا تھا۔ اس جنگ میں ایک طرف مسلمانوں کو شکست وناکامی اور اس کے نتیجے میں معاشی زبوں حالی وبربادی ہاتھ لگی تو دوسری طرف انگریزوں کی سیاسی قوت اور انکی عسکری صلاحیتوں اور انسانیت سوز کردار کا بھی اندازہ ہوگیا جس سے ہندوستانیوں کو مستقبل کے بارے میں پوری سنجیدگی اور زیرکی سے سوچنے کی کا موقع ملا اور آگے کے لائحہ عمل کی تشکیل کرنے میں مدد ملی۔ ہندوستان کی یہ پہلی جنگ آزادی اگرچہ سیاسی اور ظاہری اعتبار سے ہندوستانی ہار گئے تھے مگر فکری اور عملی اعتبار سے آزادی کی یہی پہلی جنگ اور اس کی ناکامی ہندوستان میں قومی بیداری اور وطن پرستی کے جذبہ ابھارنے اور اسے جلا بخشنے میں مددگار ثابت ہوئی اور وطنیت وقومیت کی راہ میں مشعل تادیں جس سے روشنی پاکر ہندوستانیوں کو آزادی کی راہ پر آگے بڑھنے میں مدد ملی۔

<u>وارنٹ اور گرفتاری:</u> جنگ کے خاتمہ کے بعد باغیوں کی تلاش اور دھر پکڑ شروع ہوئی اور جس شخص پر بھی ذرا سا شبہ تھا اسے پکڑ کر پھانسی دیدی جاتی تھی۔ پھانسی کا ایسا غیر انسانی بلکہ انسانیت سوز منظر نہ دنیا نے کبھی سنا تھا اور نہ آنکھوں نے کبھی دیکھا تھا اور یہ سب اس قوم نے کیا تھا جسے انسانیت کے سب سے بڑے علمبردار اور مہذب ہونے کا گھمنڈ ہے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا ابوالقاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی جو بہ نفس نفیس اس جنگ میں انگریزوں کے

خلاف لڑے تھے بھلا کیسے بچ سکتے تھے چنانچہ ان تینوں حضرات کے نام بھی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے اور ان دھڑ پکڑ اور گرفتاری کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں کیونکہ تھانہ بھون کی بغاوت اور شاملی تحصیل پر حملہ کرنے والے یہی لوگ تھے جنھوں نے تھانہ کی بستی کی دوکانوں کے چھپر جمع کر کے تحصیل گیٹ پر آگ لگا دی تھی اور جب آدھے کواڑ جل گئے تو اسی جلتی ہوئی آگ میں ان بہادروں اور جیالوں نے گھس کر تحصیل کا خزانہ لوٹ لیا تھا۔ حالات کے پیش نظر حاجی امداداللہ مہاجر مکی اپنے رفقاء مولانا محمد قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی کو الوداع کہہ کر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے سندھ، کراچی پہونچے اور وہاں سے حجاز کے لئے ہجرت کو جانے میں کامیاب ہو گئے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی گرفتار کر لئے گئے اور رام پور سے سہارنپور جیل لائے گئے۔ تین دن تک کالی کوٹھری اور پندرہ دنوں تک جیل خانہ میں بند رہنے کے بعد سہارنپور سے ننگی تلواروں کے سایہ میں پا پیادہ مظفر پور لائے گئے جہاں چھ ماہ اور بقول مولانا قاری محمد طیب نو ماہ قید رہے لیکن کوئی کاغذی ثبوت یا واضح شہادت نہ ملنے کے سبب جنوری ۱۸۶۰ء میں رہا کر دیئے گئے۔ حضرت مولانا محمد قاسم بلا کے ذہین، بہادر، نڈر اور صاحب ہمت واستقامت واقع ہوئے تھے۔ خوف وہراس نام کی انکے یہاں کوئی چیز ہی نہیں تھی اس لئے وہ کھلے عام پھرا کرتے تھے۔ لوگ ان سے احتیاط برتنے اور روپوش ہو جانے کے لئے کہا کرتے تھے مگر کسی کی نہیں سنتے تھے لہٰذا جب اعزہ واقارب اور ہمدردوں کا اصرار شدید ہو گیا تو ان کا دل رکھنے کے لئے تین دن تک روپوش رہے اور تین دن پورا ہوتے ہی باہر آ گئے اور پھر کھلے بندوں پھرنے لگے۔ لوگوں نے جب پھر اصرار کرنا شروع کیا تو کہا کہ تین دن سے زیادہ روپوش رہنا سنت سے ثابت نہیں ہے کیونکہ حضور اکرمؐ ہجرت کے وقت غار ثور میں تین دن تک ہی روپوش تھے۔

مولانا نانوتوی کی گرفتاری کے لئے ہر طرف مخبروں اور جاسوسوں کا جال بچھا دیا گیا۔ پولس تلاش وجستجو میں نانوتہ، دیوبند اور دوسرے مقامات کو ایک کئے ہوئے تھی کئی بار ایسا ہوا کہ

پولس کا خود آپ سے سامنا ہو گیا مگر مولانا کو پہچان نہ سکی اور آپ گرفتار ہونے سے بچ گئے۔ اس دوران آپ کبھی دیوبند کبھی نانوتہ کبھی املیا، گھتلا، جمنا پار، چکوالی، بوڑیہ وغیرہ آتے جاتے رہے اور بار بار پولس کو چکمہ دینے میں کامیاب ہوتے رہے۔

<u>چھتہ مسجد کا محاصرہ:</u>۔ اسی دوران جب پولس، جاسوس اور مخبر آپ کے پیچھے پڑے ہوئے تھے ایک دن آپ دیوبند کے محلہ دیوان میں قیام پذیر تھے۔ کسی مخبر نے آپ کی موجودگی کی خبر کر دی اور پولس نے آناً فاناً آپ کے مکان کا محاصرہ کر لیا گیا مگر حسن اتفاق سے پولس کے آنے سے چند منٹ پہلے ہی گھر سے نکل چکے تھے اور چھتہ مسجد چلے گئے تھے پولس نے گھر کی تلاشی لی کونہ کونہ چھان مارا مگر مولانا نانوتوی نہ وہاں تھے نہ ملے لہٰذا پولس ناکام و نامراد وہاں سے لوٹ گئی پھر مخبر نے اطلاع دی کہ چھتہ مسجد میں دیکھے گئے ہیں چنانچہ پولس افسر مع اپنے سپاہیوں کے چھتہ مسجد جا پہنچ گیا۔ افسر نے سپاہیوں کو ذرا دروازے پر ہی رہنے کے لئے کہا اور خود مسجد کے اندر داخل ہو گیا اس وقت مولانا نانوتوی مسجد میں ہی ٹہل رہے تھے دیکھا کہ پولس افسر آ رہا ہے مگر آپ انتہائی سکون و اطمینان سے چہل قدمی میں مصروف رہے۔ پولس افسر مولانا نانوتوی کو پہچانتا نہیں تھا چنانچہ خود انھیں سے پوچھا کہ کیا مولانا محمد قاسم نانوتوی یہاں ہیں مولانا نے چند قدم ہٹ کر جواب دیا ابھی تو یہیں تھے ہو سکتا ہے ہوں آپ خود دیکھ لیجئے۔ پولس افسر نے پوری مسجد تلاش کر ڈالی آخر ناکام ہو کر چلا گیا اور دروازے پر تعینات پولس والوں سے کہا کہ چلو مخبر نے غلط اطلاع دیدی تھی۔

مذکورہ واقعہ سے ملتا جلتا ایک واقعہ چکوالی میں بھی پیش آیا تھا۔ ہوا یہ کہ بہادر نسبتی شیخ نہال احمد رئیس دیوبند نے دوران وارنٹ گرفتاری اپنے گاؤں چکوالی میں قیام پر اصرار کیا کہ دیوبند میں ہر وقت خطرات منڈلاتے رہتے ہیں چکوالی ایک دور افتادہ گاؤں ہے یہاں سے مخبری کم ہو پائے گی لہٰذا یہیں قیام فرمائیں بار بار کے انکے اصرار پر آپ چکوالی چلے گئے لیکن ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ مخبروں کے ذریعہ پولس کو اطلاع مل گئی کہ آپ چکوالی میں دیکھے جاتے ہیں چنانچہ پولس چکوالی بھی جا پہونچی اور گاؤں کا

محاصرہ کرلیا۔ شیخ نہال احمد پریشان ہوگئے اور حواس باختہ ہوا تھے اور اسی بدحواسی کی حالت میں مولانا سے صورت حال کا اظہار کرنے لگے مولانا نے کہا کہ تمہاری حواس باختگی مجھے گرفتار کرادیگی۔ تم مطمئن رہو اور چہرے بشرے سے کسی قسم کی پریشانی ظاہر مت ہونے دو بلکہ تم اندر ہی رہو میں اپنا بچاؤ کرلوں گا۔

پولس کپتان جب دروازے پر آ گیا تو حضرت نانوتوی خود باہر آ گئے اور آگے بڑھ کر پوچھا کہ کیسے زحمت کی ہے پولس افسر نے جواب دیا کہ ہمارا ملزم اسی مکان میں ہے ہم اس کی گرفتاری کیلئے آئے ہیں آپ نے بڑے تپاک سے اندر آنے کے لئے کہا۔ کپتان نے آپ سے پوچھا کہ کیا آپ مولانا محمد قاسم کو جانتے ہیں تو آپنے جواب دیا کہ خوب جانتا ہوں اور پہچانتا بھی ہوں۔ کپتان نے گھر کے کونے کونے کو چھان مارا اور جب پورے گھر کی تلاشی لے چکا تو مایوس ہوکر یہ کہتے ہوئے چلا گیا کہ مخبر نے پھر غلط اطلاع دی تھی۔

گرفتاری میں ناکامی کے اسباب:- ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں انتظامی عمور کے تمام اختیاراتی عہدوں پر انگریز ہی معمور کئے جاتے تھے کلکٹر اور ڈپٹی کلکٹر اور کپتان وغیرہ عموماً انگریز ہی ہوا کرتے تھے بعض بہت ہی اہم یا وفادار ملازم کو ڈپٹی کلکٹر بنا دیا جاتا تھا جیسا کہ سرسید احمد خاں کو بنایا گیا تھا اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران وہ بجنور میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے انھوں نے اس ہنگامے میں انگریزی افسروں کو بچانے میں بڑی مدد کی تھی مگر خود انکے خاندان کے لوگ اس ہنگامے میں تباہ و برباد ہوگئے تھے۔ مولانا نانوتوی کی گرفتاری کے لئے عموماً انگریز افسر ہی آتے تھے کسی ایسے آدمی کو اپنے ساتھ نہیں لاتے تھے جو مولانا کو جانتا پہچانتا ہو کیونکہ اس ہنگامے کے بعد انگریزوں کا اعتماد ہندوستانیوں پر سے اٹھ چکا تھا چنانچہ اسی وجہ سے وہ مولانا کو گرفتار کرنے میں بار بار ناکام ہوجاتے تھے۔

انیسویں صدی کے ہندوستان میں دہلی اور اطراف دہلی میں علماء مشائخ کا ایک مخصوص انداز ہوتا تھا اور چہرے مہرے، رکھ رکھاؤ وضع قطع اور لباس وعمامہ اور رہن سہن سے بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے لیکن آپ کے سادہ مزاجی میں اس ظاہری رکھ رکھاؤ کی کوئی گنجائش نہیں تھی آپ عموماً موٹے کپڑے کا

کرتہ اور نیلے رنگ کی لنگی پہنتے تھے اور قلندرانہ صفت انسان تھے جس سے انگریزی افسر عموماً مغالطے میں پڑ جاتے تھے اور مولانا گرفتار ہونے سے بچ جاتے تھے ایک اور نفسیاتی وجہ یہ بھی تھی کہ بڑے سے بڑے اور خطرناک سے خطرناک حالات میں بھی انکی جرأت اور ہمت، بے خوفی اور اطمینان حالی متاثر نہیں ہو پاتی تھی۔ وہ خود انگریز افسران سے بڑھ کر ملتے تھے اور نفسیاتی طور پر ذرا بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ خود ہی مولانا قاسم ہیں چنانچہ پولس افسران خود آپ ہی سے ملتے تھے، گفتگو کرتے تھے مگر یہ ذرا بھی نہیں بھانپ پاتے تھے کہ یہی مولانا قاسم ہو سکتے ہیں چنانچہ اپنے اس نفسیاتی حربے سے بھی مولانا بار بار پولس کو ناکام بناتے رہے چنانچہ گرفتاری کا وارنٹ لیکر پولس افسران آپ سے بار بار ملتے رہے اور نامراد لوٹتے رہے۔

عام معافی کا اعلان:- ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں اگرچہ ہندوستانیوں کو ناکامی ہوگئی تھی اور انہیں بے پناہ اور بے اندازہ جانی ومالی نقصانات اٹھانے پڑے تھے لیکن اس کا ایک فوری فائدہ یہ ہوا تھا کہ ہندوستانی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے لٹیروں اور بقالوں کے ہاتھوں سے نکل کر براہ راست تاج برطانیہ کے زیر نگیں آگئی تھی جس سے ہنگامے کے تقریباً ایک سال بعد عام معافی کا اعلان ہوگیا تھا۔

پہلی جنگ آزادی میں شاملی کے محاذ پر رہنمایانہ کردار ادا کرنے کے سبب پولس کی تلاش وجستجو کا یہ سلسلہ تقریباً دو سال تک چلتا رہا اور مولانا کو ان دو سالوں میں کبھی بھی سکون وچین کے اوقات میسر نہیں ہوئے لہٰذا اس دوران وہ کسی قسم کا علمی یا قومی کوئی کام انجام نہ دے سکے۔ اس کے علاوہ اپنے پیر ومرشد کی انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں ہجرت، علماء ومشائخ اور مسلمان سربرآوردہ شخصیات کو پھانسی اور روز بروز بڑھتی مصیبتوں اور پریشانیوں سے مولانا ذہنی طور پر کافی انتشار کا شکار ہوگئے تھے۔ لیکن تاج برطانیہ کے عام اعلان معافی سے لوگوں نے کچھ راحت کی سانس لی مگر انگریزی افسران پھر بھی ملزموں کو گرفتار کرتے رہے کہ عام معافی صرف ہلکی فرد جرم والے اشخاص کیلئے ہے اس لئے عام اعلان معافی کے باوجود بھی گرفتاریاں ہوتی رہیں اور جن لوگوں نے مذکورہ ہنگامہ میں شرکت کی تھی وہ بدستور روپوشی کی

زندگی گزارتے رہے اور حالات کی تبدیلی کا انتظار کرتے رہے۔

۱۸۵۷ء کی اس پہلی جنگ آزادی کو انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا۔اس جنگ میں ہندوستانیوں کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے اپنے جوش انتقام میں جس درندگی ،سفاکی اور انسانیت سوزی کا مظاہرہ کیا تھا اس کی مثال تاریخ کے صفحات میں ملنا مشکل ہے۔انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت اپنی عیاری اور مکاری سے مسلمانوں سے چھینی تھی اس لئے مسلمانوں کو ہی وہ اپنا دشمن اول سمجھتے تھے اس کے علاوہ اس ہنگامے میں مسلمانوں نے ہی سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اس لئے انکے جوش انتقام کے شکار بھی سب سے زیادہ مسلمان ہی ہوئے تھے۔انگریزوں نے مسلمانوں کو مارنے ، پھانسی دینے ،قتل کرنے اور تباہ و برباد کرنے کیلئے ایسی ایسی انسانیت سوز ،ظالمانہ اور سفاکانہ سزائیں ایجاد کیں کہ خود بعض انصاف پسند اور انسانیت حامی انگریز مورخین و مفکرین نے بھی اس کی مذمت کی تھی جو آج بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں اور دنیا میں اپنے آپ کو بزعم خود سب سے زیادہ مہذب سمجھنے والے انگریزوں کے لئے سوالیہ نشان بنی ہوئی ہیں۔

سفر حج:- حکومت برطانیہ کی عام معافی کے اعلان کے باوجود جن حضرات نے اس عوامی بغاوت میں حصہ لیا تھا وہ بدستور روپوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔آپ کے پیرومرشد حاجی امداداللہ مہاجر مکی پہلے ہی ہجرت کرکے مکہ مکرمہ جا چکے تھے۔مولانا رشید احمد گنگوہی گرفتار ہو چکے تھے مگر اللہ کی رحمت نے انھیں پھانسی سے بچا لیا تھا۔مولانا نانوتوی جنھوں نے شاملی کے محاذ پر انگریزوں کے خلاف رہنمایانہ کردار ادا کیا تھا عام اعلان معافی کے باوجود روپوشی کی زندگی بسر کرنے اور بچ بچا کر رہنے پر مجبور تھے اور مسلسل جگہیں بدلتے رہتے تھے۔کبھی نانوتہ کبھی دیوبند اور کبھی دوسری جگہوں پر آتے جاتے رہتے تھے جس سے یکسوئی اور سکون قطعی میسر نہیں تھا اور مسلسل ذہنی کشمکش کا شکار رہتے تھے چنانچہ آپ نے سفر حج کا ارادہ کر لیا اور اس کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

آپ نے اپنے پیرومرشد حاجی امداداللہ مہاجر مکی کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تھی اور وہ ہجرت

کر کے مکہ مکرمہ جا چکے تھے۔ حضرت نانوتوی نے بھی خفیہ طور پر حج کے ارادے سے مکہ مکرمہ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اب سوال زادِ سفر کا تھا اور موجودہ حالات میں گھر کی مالی حالت بھی کافی خراب ہو چکی تھی پھر بھی حج کا سفر کیا۔ اخراجات کا کیا بندوبست ہوا اس بارے میں کوئی خاص جانکاری نہیں مل پا رہی ہے۔ کچھ لوگوں کا قیاس ہے کہ اس کا انتظام آپ کے برادر نسبتی جناب نہال احمد جنکا مولانا سے خصوصی تعلق تھا اور آپ دیوبند کے روساء میں سے تھے انھوں نے ہی کیا ہوگا۔

رفیق سفر حج:- مولانا نانوتوی نے اپنے سفر حج کا پروگرام انتہائی رازداری سے بنایا تھا اور اسکی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی تھی پھر بھی آپ کے بچپن کے دوست مولانا محمد یعقوب صاحب کو اسکی خبر ہوئی تو آپ بے چین ہو گئے اور عجلت میں ہی وہ تمام تر بے سروسامانی کے باوجود مولانا سے جا ملے حج بیت اللہ کا یہ سفر جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ بمطابق دسمبر ۱۸۶۰ء میں شروع ہوا۔ یہ سفر بھی آزادانہ نہیں بلکہ رازدارانہ تھا اور خشکی کے راستے کے بجائے بادبانی کشتی کے ذریعے تھا۔ آپ پہلے پنجاب پہونچے اور پھر وہاں سے سندھ اور کراچی سے بادبانی جہاز کے ذریعہ مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہوئے اور ٹھیک چھ ماہ کے مسلسل سفر کے بعد ذیقعدہ ۱۲۷۷ھ میں مکہ مکرمہ پہونچنے میں کامیاب ہو گئے۔

کراچی سے جس روز جہاز روانہ ہوا وہ ماہ رمضان کی چاندرات تھی اور جہاز پر ہی رمضان کا چاند دیکھا گیا تھا اور جہاز میں ہی نماز تراویح شروع ہوئی تھی اور آپ کو نماز تراویح میں قرآن پڑھا کر دلی مسرت ہوئی تھی اور اسی سفر حج میں نماز تراویح سے لوگوں کو پہلی بار یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ آپ حافظ قرآن بھی ہیں اور جس روز قرآن ختم ہوا آپ کافی خوش تھے اور جب جہاز مکہ پہونچا تو آپ وہاں سے حلوہ مسقط خرید کر لوگوں میں تقسیم فرمایا تھا۔

یہ سفر بڑی خوشی وشادمانی کے ساتھ جاری تھا۔ آپ اپنے رفقاء سے بڑی خوش دلی سے گفتگو کرتے تھے۔ خوشی اس لئے بھی تھی کہ یہ آپ کا پہلا سفر حج تھا اور پہلی بار سعادت حج بیت اللہ نصیب ہونے والی تھی۔ دوسری خوشی کی بات یہ تھی کہ پیرومرشد سے بھی شرف ملاقات ہونے والی تھی گویا دوگنا

سعادت میسر ہونے والی تھی اس لئے یہ چھ ماہ کا طویل سفر بڑی آسانی اور راحت واطمینان سے پورا ہونے لگا تھا اور ماہ ذی قعدہ میں آپ مکہ مکرمہ پہونچے۔ اور حج وغیرہ کے ضروری کام میں لگ گئے تھے اور حج وزیارت کے بعد بمبئی کے راستے واپسی ہوئی اور ربیع الاول ۱۲۷۸ھ مطابق دسمبر ۱۸۶۱ء میں سفر تمام ہوا۔ اس سفر میں پورا ایک سال لگ گیا۔ ممبئی سے ناسک ہوتے ہوئے سیدھے نانوتہ تشریف لائے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک عوامی بغاوت کے سارے مقدمے یا تو اٹھا لئے گئے تھے یا ختم کر دیئے گئے تھے۔ اس لئے اب کسی قسم کی گرفتاری وغیرہ کا خطرہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔

سفر حج کی واپسی کے بعد آپ کبھی نانوتہ اور کبھی دیوبند میں رہنے لگے تھے اور ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد ہو چکے تھے کچھ لوگوں نے آپ سے بخاری پڑھنے کی درخواست کی تھی آپ نے منظور بھی فرما لیا تھا اور نانوتہ میں ہی بخاری شریف کا درس دینے لگے۔ مولانا محمد یعقوب نے اسی زمانہ میں نانوتہ میں آپ سے بخاری کا درس لیا تھا یہ سال غالباً ۱۸۶۲ء کا تھا اور جب بعد میں دار العلوم دیوبند باقاعدہ قائم ہو گیا تو آپ صدر المدرسین کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔

تصحیح کتب:۔ سفر حج کے بعد آپ نانوتہ میں بخاری شریف کا درس دینے میں مصروف تھے آپ کے کچھ خیر خواہوں نے آپ کے ذریعہ معاش کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ مولانا احمد علی صاحب کا مطبع تو ۱۸۵۷ء میں برباد ہو چکا تھا اس لئے دہلی جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ آپ کے ایک عقیدت مند منشی ممتاز علی جو میرٹھ میں اپنا ذاتی مطبع قائم کئے ہوئے تھے انھوں نے آپ سے میرٹھ آنے کی درخواست کی تاکہ مطبع کی نگرانی اور تصحیح کتب کا کام بآسانی انجام پزیر ہو سکے۔ یہ نہ تو نوکری تھی نہ ہی ملازمت بلکہ ہم خیال مخلص لوگوں کی یکجائی کا ذریعہ تھا اس سے کچھ یافت بھی ہو جاتی تھی۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی اس سے قبل جب مکتبہ مجتبائی میں کام کر رہے تھے اسی دوران شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ کی ایک حمائل بھی طبع ہوئی تھی جس کی تصحیح کا کام آپ نے ہی انجام دیا تھا آپ

نے اس میں متعدد تبدیلیاں بھی کی تھیں اور عام دستور کے مطابق زیر سطور نہ کر کے ہر صفحہ کی آیتوں پر نمبر لگا کر ترجمہ حاشیہ پر طبع کیا تھا۔ اس سے قبل قرآن شریف کے نسخوں میں آیتوں پر نمبر نہیں لگائے جاتے تھے۔ آیتوں پر نمبر لگانے کا کام سب سے پہلے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ہی شروع کیا تھا۔ ان نمبروں کی ترتیب سے حاشیہ پر اردو ترجمہ درج کر دیا تھا جس سے اس حمائل شریف کی ایک امتیازی خصوصیت ہو گئی تھی اور حمائل شریف کے آخر میں یہ اطلاع بھی شائع کی گئی تھی کہ یہ نسخہ خاص میرٹھ کے مطبع مجتبائی میں ۱۲۸۶ھ میں شائع ہوا ہے اور اس حمائل شریف کی تصحیح کا کام مولانا محمد قاسم نانوتوی نے انجام دیا ہے۔ اس حمائل شریف کی مولانا نے تاریخ طبع بھی نکال لی تھی۔

منشی ممتاز علی نے میرٹھ کے مطبع میں مولانا نانوتوی کو بلا لیا تھا مگر کچھ ہی دنوں بعد خود حجاز چلے گئے تھے اور کافی دنوں تک وہاں رہ گئے تھے جس سے مطبع کا کام ٹھپ ہو گیا تھا۔ اسی زمانہ میں جب مولوی محمد ہاشم نے مطبع ہاشمی قائم کیا تو مولانا نانوتوی مولوی محمد ہاشم کی درخواست پر مطبع ہاشمی سے منسلک ہو گئے تھے اور کچھ دنوں بعد جب منشی ممتاز علی حجاز سے ہندوستان واپس آئے تو ان کا مطبع فروخت ہو چکا تھا۔ انھوں نے اب میرٹھ کے بجائے ایک دوسرا مطبع مصطفائی کے نام سے دہلی میں قائم کیا اور منشی ممتاز علی سے مولانا کا دلی تعلق تھا اس لئے اپنے مخلص دوست منشی ممتاز علی کے کہنے پر مولانا مطبع مصطفائی سے وابستہ ہو گئے تھے لیکن کچھ ہی دنوں بعد آپ دہلی سے پھر میرٹھ آ گئے تھے۔

قیام دار العلوم کا خیال:۔۔۔ جس زمانے میں آپ میرٹھ میں تصحیح کے کام میں مصروف تھے اسی دوران دیوبند کے کچھ اکابرین کے ذہن میں دیوبند میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا چنانچہ اس کے لئے ذہنی طور پر تیاری شروع ہو گئی اور جب کچھ رقم کی فراہمی کا انتظام ہو گیا تو اس کی اطلاع حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کو میرٹھ میں دی گئی اس طرح دیوبند تحریک اور دار العلوم کے قیام کے لئے راہ ہموار ہونی شروع ہو گئی جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔

درس وتدریس کا مشغلہ:۔۔۔ قیام میرٹھ کے دوران ہی آپ نے فاضل اوقات میں درس وتدریس کا

کام شروع کر دیا تھا لیکن درمیان میں یہ سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ جب دوبارہ سکون میسر ہوا تو آپ نے یہ سلسلہ پھر شروع کر دیا۔ آپ خاص طور سے ''صحاح ستہ'' کی تعلیم دیتے تھے اور بہت سے علماء باقاعدہ آپ سے حدیث کا درس لیتے تھے۔ خود مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے ''مسلم شریف'' کے درس میں اپنی شرکت کا اقرار کیا ہے جو قیام میرٹھ کے دوران خود مطبع مجتبائی میں ملازم رہ چکے تھے اور قیام دارالعلوم کے بعد اس کے بعد میں صدر مدرس بھی ہوئے تھے۔

قیام میرٹھ کے دوران فاضل اوقات میں آپ باقاعدہ بخاری شریف اور مسلم شریف کی تعلیم دیتے تھے۔ اس میں شرکت کرنے والے طلبہ اور علماء کی تعداد بھی اچھی خاصی ہوتی تھی اور انکی باقاعدہ جماعت بندی بھی کی گئی تھی۔ آپ کے درس حدیث کا طریقہ بھی وہی تھا جو شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی اور شاہ اسحاق محدث دہلوی کا طرۂ امتیاز تھا جسکا اعتراف مولانا محمد علی بانی دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) نے بھی کیا ہے۔ جنہوں نے میرٹھ میں مولانا نانوتوی کے ایک درس حدیث میں شرکت کی تھی اس سبق میں جس میں مولانا محمد علی موجود تھے اس میں مولانا محمود الحسن شیخ الہند بھی شامل تھے جو مولانا نانوتوی کے باقاعدہ شاگرد تھے اور آپ کی سند حدیث کا ایک طریق حضرت نانوتوی کے ذریعہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک بھی پہونچتا ہے۔

مولوی رحیم اللہ بجنوری جو حضرت مولانا نانوتوی کے شاگرد ہیں ان کا بیان ہے کہ رام پور کے علمی حلقوں میں درس نظامیہ کی تکمیل کے بعد میں حضرت نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ ان دنوں نانوتہ میں درس بخاری دیا کرتے تھے اتفاق سے ایک دن میں دوران درس بے وضو پہونچ گیا اور درس میں جا بیٹھا تو آپ نے پہلے ہاتھوں سے اشارہ کیا پھر بلا کر فرمایا کہ صحیح بخاری میں بلا وضو نہیں بیٹھنا چاہیئے۔

مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے اپنی کتاب میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کے مثنوی مولانا روم کے پڑھانے کا بھی ذکر کیا ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے آپ سے آب حیات مرتبہ مولانا محمد قاسم نانوتوی سبقاً سبقاً پڑھنے کا بھی اقرار کیا ہے۔ جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ آپ عام مدرسین کی طرح

صرف نصاب کی مروجہ کتابوں کا درس نہیں دیتے تھے بلکہ طالبین اور شائقین کے ذوق وشوق کے مطابق کتابیں پڑھا دیتے تھے جیسا کہ مولانا حکیم منصوری مراد آبادی ثم حیدر آبادی نے مولانا نانوتوی سے ملا جلا پڑھنے کا تذکرہ کیا اور تاریخ دارالعلوم کے مصنف سید محبوب رضوی نے مولانا قاسم کے اقلیدس پڑھانے کا بھی ذکر کیا ہے۔ جبکہ مولانا نے اقلیدس اور حساب کی تعلیم کسی استاد سے نہیں حاصل کی تھی بلکہ دہلی کالج کے طالب علمی کے زمانہ میں مولانا مملوک علی نے آپ سے کہا تھا کہ اقلیدس خود دیکھ لو اور قواعد حساب کی مشق کرلو لہٰذا وہ دونوں مضامین مولانا نے ذاتی مطالعہ سے حاصل کیا تھا۔

نامور شاگردان:۔ تعلیم سے فراغت کے بعد سے ہی آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ ہمیشہ باقی رکھا اور مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھائیں اور مختلف جگہوں پر مسند درس بچھائی چنانچہ کبھی نانوتہ کبھی میرٹھ اور کبھی دیوبند میں آپ کا حلقہ درس قائم ہوتا رہا اور تشنگان علوم آتے رہے اور درس وتدریس کا مشغلہ جاری رہا جس کا نہ کوئی اندراج ہوتا تھا اور نہ ہی رجسٹریشن ہوتا تھا اس لئے آپ کے شاگردوں کی کوئی فہرست بھی مرتب نہ ہوسکی لہٰذا چند ایسے شاگردانِ رشید جن کا ذکر مختلف واقعات کے ذیل میں پایا جاتا ہے۔ اور جو اپنے دور کے نامور عالم وفاضل بھی ہوئے ان کی ایک مختصر فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

(۱) شیخ الہند مولانا محمود الحسن (۲) مولانا فخر الحسن گنگوہی (۳) مولانا احمد حسن محدث امروہوی (۴) مولانا عبدالرحمٰن امروہوی (۵) مولانا حافظ عبدالاحد (۶) مولانا حکیم منصور علی خاں (۷) مولانا عبدالعلی میرٹھی وغیرہ کا نام سرفہرست ہے۔

نبی کریمؐ سے محبت وعقیدت:۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نبی کریمؐ سے بے پناہ محبت و عقیدت رکھتے تھے چنانچہ آپ کا حب رسول اور عشق محمدی بے مثال ہے۔ آپ کو سرکار دوعالم کی ایک ایک ادا اور ایک ایک سنت سے والہانہ لگاؤ تھا۔ آپ کو نبی کریمؐ سے ایسی محبت تھی کہ اس محبت کے سامنے لیلیٰ مجنوں کی فرضی داستان عشق بھی ماند پڑ گئی تھی۔ آپ کی محبت نبی اتنے عروج پر

تھی کہ آپؒ کے تمام تعلق وعلاقہ پر نثار تھے۔آپ کے ہر لگاؤ اور ہر پسند کو دل وجان سے پسند کرتے تھے۔آپ کے ایک ارشاد پر دنیا کی قیمتی سے قیمتی شے بھی بے وقعت تھی۔آپؐ کے پیارے اقوال وافعال اور اسوۂ حسنہ کے مقابلے میں دنیا کی ہر لذت اور ہر خوشی بے معنی تھی۔آپ کے عشق نبی کا یہ حال تھا کہ بقول مولانا محمد حسین مدنی تمام عمر سبز رنگ کا جوتا صرف اس لئے نہیں پہنا کہ قبۂ مبارک بھی سبز رنگ کا ہے لہٰذا جس رنگ کی مناسبت روضۂ نبی سے ہو اس کو پیر میں نہیں دیکھا جاسکتا جب گنبد خضرا کے ظاہری رنگ سے اس قدر عقیدت ومحبت تھی تو بھلا اس کے اندر مقیم محسن انسانیت سے عقیدت ومحبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

آپ کے عشق رسولؐ میں فریفتگی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ آپ حج کے لئے تشریف لے گئے اور جب مدینہ کے لئے روانگی ہوئی تو مدینہ منورہ سے کئی کلومیٹر پہلے ہی اپنا جوتا اتار دیا اور برہنہ پا ہو گئے کیونکہ آپ کے دل وضمیر نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ دیار حبیب میں جوتا پہن کر چلیں جبکہ راستے میں سخت نوکیلے سنگریزے اور پیروں میں چبھنے والے پتھروں کے ٹکڑے تھے۔اس کا تذکرہ مولانا سید احسن گیلانی نے اپنی کتاب میں حکیم منصور علی خاں صاحب حیدرآبادی کے حوالے سے کیا ہے کہ ''جب منزل بہ منزل بدینہ شریف کے قریب ہمارا قافلہ پہونچا جہاں سے روضۂ پاک صاحب لولاک نظر آتا تھا فوراً جناب مولانا (محمد قاسم) اپنے نعلین اتار کر بغل میں دبالیں اور پا برہنہ چلنا شروع کیا۔'' (سوانح قاسمی سید احسن گیلانی صفحہ ۶۰-۶۱)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شریک ہونے کے سبب جب آپ کے خلاف وارنٹ اور حکم گرفتاری جاری ہوا تو آپ روپوش نہیں ہوتے تھے لیکن جب ہمدردوں اور رشتہ داروں کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو آپ تین دن تک روپوشی کی زندگی گذارنے کے بعد فوراً باہر آگئے اور کھلے عام آنے جانے لگے لوگوں نے جب پھر اصرار کیا تو فرمایا کہ تین دن سے زیادہ روپوشی سنت سے

ثابت نہیں ہے کیونکہ ہجرت سے قبل غارثور میں نبیؐ نے تین دن تک ہی روپوشی کی زندگی بسر کی تھی یہ تھی عشق رسول کی حالت کہ اپنی جان کے لالے پڑے ہیں مگر سنت رسول سے زیادہ روپوشی کے لئے کسی بھی حال میں تیار نہیں ہیں۔

مولانا موزوں طبع بھی تھے اور سلیم الطبع بھی۔ آپ نے شعر وشاعری سے بھی قدرے شغف رکھتے تھے جیسا کہ قصائد قاسمی سے ظاہر ہوتا ہے آپ کی شعری تخلیقات اور نثری نگارشات سے بھی جگہ جگہ آپ کے عشق رسول کا اظہار ہوتا ہے۔ غرض کہ آپ کی ساری زندگی اور زندگی کی ساری تگ ودو اور سرگرمیوں میں سنت رسولؐ اور حیات طیبہ کی اطباع اور ان سے بے پناہ عقیدت ومحبت کا محور تھی۔

دوسرا اور تیسرا سفر حج:- آپ نے ۱۲۷۷ھ بمطابق ۱۸۶۰ء میں پہلا حج بیت اللہ کیا تھا۔ دوبارہ سفر حج ۱۲۸۶ھ بمطابق ۱۸۶۹ء میں کیا تھا اسی طرح تیسرا اور آخری حج ۱۲۹۴ھ بمطابق ۱۸۷۷ء میں کیا تھا۔ ایک مسلمان پر پوری زندگی میں صرف ایک بار حج فرض ہے مگر آپ عبادت الہیٰ اور سنت نبیؐ میں اس قدر سرشار رہتے تھے کہ ہر وہ چیز جو خدا اور خدا کے رسول کو پسند تھی آپ کو بھی پسند تھی آپ کو بھی دل وجان سے محبوب تھی۔ چنانچہ دوسرا اور تیسرا حج بھی آپ کی خانہ کعبہ اور روضۂ مطہرہ سے بے پناہ عقیدت واحترام کا ہی ثبوت ہے کیونکہ اس زمانہ میں حج آج کی طرح آسان نہیں تھا۔ حج کا سفر بے پناہ صعوبتوں سے پر ہوتا تھا اور تقریباً ایک سال کا عرصہ درکار ہوتا تھا اور بے پناہ اخراجات اور سفر خدشات سے پر ہوتا تھا پھر بھی آپ نے تین بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔

آخری ایام زندگی:- مولانا محمد قاسم نانوتوی اپنے تیسرے اور آخری سفر حج کی واپسی میں جہاز پر ہی سخت بیمار ہوگئے تھے۔ جہاز میں علاج کی مناسب سہولیات نہ ہونے کے سبب آپ کے مرض میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ جہاز میں وبائی بیماری بھی پھیل گئی تھی اور روزانہ ایک دو آدمی

انتقال کر رہے رتھے اس لئے اس آخری سفر حج کی واپسی کے دوران صورت حال انتہائی تشویشناک تھی آب وہوا اور مزاج کے مطابق جو علاج ہونا چاہئے تھا وہ جہاز میں میسر نہیں تھا لہٰذا ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' والی کیفیت پیدا ہوگئی تھی جس سے نقاہت وکمزوری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اٹھنا بیٹھنا اور چلنا پھرنا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ جہاز کے ڈاکٹر نے دو تجویز کی اور مرغ پلانے کیلئے کہا یہاں تک کہ جہاز پر خود ہی مرغ فراہم کردیا جس سے قدرا افاقہ ہوگیا۔ عدن کے مقام پر جہاز کو لنگر انداز کردیا گیا مگر مسافروں کو جہاز سے اترنے اور شہر میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں بھی ضرورت کے مطابق دوائیں دستیاب نہ ہوسکیں صرف کچھ لیمو اور سنگترے ہی مل سکے اور اسی کے استعمال سے قدر بہتری پیدا ہوگئی اور اسی حالت میں جہاز ممبئی پہونچ گیا۔ اس آخری سفر حج میں آپ کے رفیق سفر محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی اور حکیم منصور احمد مرادآبادی آپ کے خصوصی تیماردار تھے اور ان میں سے کوئی نہ کوئی ہر وقت آپ کی تیمارداری میں جٹا رہتا تھا۔ ممبئی پہنچنے کے بعد جب کچھ مزید افاقہ ہوا تو اٹھنے بیٹھنے کے لائق ہو گئے لیکن ضعف ونقاہت سے جہاز سے اتر کر فوراً سفر کرنے کے لائق نہیں تھے اس لئے تین چار روز ممبئی میں قیام اور علاج ومعالجہ کے بعد جب روبہ صحت ہونے لگے تو ٹرین کا سفر شروع ہوا۔

لیکن حج کی واپسی سے وطن لوٹنے کے بعد بیماری بھی جاتی رہی لیکن ضیق النفس اور کھانسی جم گئی جس سے دورے پڑنے لگے مگر اس حالت میں آپ نے درس وتدریس کا کام شروع کردیا اور طلباء کی ایک جماعت کو ترمذی شریف پڑھانے لگے مولانا عبدالرحمٰن بجنوری نے اسی دور میں آپ سے ترمذی شریف پڑھی تھی۔

اسی بیماری کے ایام میں آریہ سماج کے بانی اور ستیارتھی پرکاش کے مصنف پنڈت دیانند سرسوتی نے رڑکی اور میرٹھ میں اسلام کے خلاف فتنہ برپا کر رکھا تھا چنانچہ آپ نے اپنی بیماری اور کمزوری کے باوجود رڑکی اور میرٹھ کے دو سفر کئے اور دوران سفر گھنٹوں گھنٹوں کئی دنوں تک

تقریریں بھی کیں جسکا آپ کی صحت پر کافی اثر ہوااور یہ اثر کبھی بیماری میں شدت کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا تو کبھی کمزوری اور پریشانی کی اضافہ کی شکل میں۔ اس طرح تقریباً دو سال تک طبیعت ناساز رہی اور جب کبھی قدر افاقہ ہوا تو علاج ومعالجہ سے بے توجہی بھی ہونے لگی۔

علاج ومعالجہ:- آپ کے ارادت منداور جاں نثار حکیم مشتاق احمد دیوبندی نے آپ کے علاج کی ذمہ داری اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ حکیم صاحب اپنے زمانے کے مشہور طبیب اور حاذق تھے اور بڑے ہی تجربہ کار اور ماہر معالج بھی۔ انہوں نے بڑی ہی دلجمعی اور تن دہی سے آپ کا علاج شروع کیا اور دواؤں کی تجویز کی۔ تیاری اور استعمال کرانے تک کا کام اپنے نگرانی میں کراتے تھے اور رفتار صحت پر مسلسل نظر رکھتے تھے۔ ہر تبدیلی کو ذہن نشین رکھتے تھے اور بتدریج علاج کرتے تھے مگر بیماری تھی کہ بدستور بڑھتی جاتی تھی۔ آپ کے دوسرے مخلص عقیدت مند حکیم عبدالرحمٰن جو مظفرنگر جیل میں سرکاری ڈاکٹر تھے انھیں جب آپ کی بیماری کی تفصیل کا علم ہوا تو انہوں نے ازخود اپنی خدمات پیش کیں اور مولانا کو مظفرنگر لے گئے۔ ابتداء میں آپ کے علاج سے کافی افاقہ محسوس ہوا لیکن ہر وقت کی تھوڑی تھوڑی جسمانی حرارت کی موجودگی کو دور کرنے کے لئے یونانی، ایلوپیتھک اور آیورویدک کے طریقۂ علاج کا بھی انہوں نے سہارا لیا اور قیمتی سے قیمتی علاج کیا مگر فائدہ ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے استاذ گرامی اور مصحح بخاری شریف جن سے حضرت نانوتوی نے ابوداؤد شریف پڑھی تھی مولانا احمد علی محدث سہارنپوری پر فالج کا حملہ ہوگیا تھا۔ آپ کو جب یہ خبر ملی تو فوراً آپ کی تیمارداری میں سہارنپور جانے کے لئے بے چین ہو اٹھے۔ آپ کے اصرار پر بدرجۂ مجبوری آپ کو سہارنپور لے جایا گیا اور عیادت کے بعد اسی دن شام کو سہارنپور سے دیوبند لایا گیا لیکن اس سفر سے آپ کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہوگیا اور کچھ دنوں بعد جب پھر تھوڑا افاقہ ہوا تو پھر سہارنپور جانے اور استاذ گرامی کی عیادت کے لئے مصر ہو گئے تو مجبوراً پھر آپ کو

سہارنپور پہونچایا گیا۔ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری پر فالج کا اثر قدرے کم ہوگیا تو گفتگو وغیرہ کرنے لگے تو مولانا نانوتوی سے فرمایا کہ آپ چند دنوں تک یہیں قیام کریں تو آپ نے رضامندی ظاہر کردی اور تقریباً دو ہفتے تک وہیں قیام پذیر رہے مگر معمولات میں تبدیلی کے سبب مرض پھر بڑھ گیا اور ضیق النفس کا دورہ پھر پڑنے لگا۔ جب اس کی خبر دیوبند پہونچی تو حافظ انوارالحق صاحب آکر آپ کو سہارنپور سے دیوبند لے گئے۔ معالجین کے مشورے سے فصد کھولی گئی جس سے فوری طور پر درد کی شدت میں کمی واقع ہوگئی۔ ایک دوسری تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ دہلی سے مقوی دوائیں منگوائی گئیں کہ ان کے استعمال سے کمزوری دور ہوجائے مگر اس کا الٹا اثر یہ ہوا کہ پھر حرارت جسمانی بڑھ گئی اور غفلت تک پیدا ہونے لگی۔

حکیم صاحب نے معدہ کی تنقیہ کا مشورہ دیا اور دو ملین دوائیں استعمال کرائی گئیں جس سے اجابت تو ہوگئی مگر کمزوری پھر بڑھ گئی اور پھر بے ہوشی طاری ہونے لگی کبھی کبھی تشنج کی کیفیت رہنے لگی۔ مولانا رفیع الدین نے اطراف وجوانب متعلقین اور عقیدت مندوں کو خطوط لکھ لکھ کر ان کے حالات سے مطلع کردیا جس کی وجہ سے امروہہ، میرٹھ، مرادآباد، سہارنپور، گنگوہ اور نانوتہ وغیرہ سے ایک جم غفیر دیوبند میں ہوگیا۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ آپ کو آپ کے رہائشی مکان میں لے جایا جائے خدام نے ملکر چارپائی اٹھائی اور آپ کو مکان پر پہونچا دیا اس سے ایک روز قبل مولانا رشید احمد گنگوہی تشریف لائے اور مستقل آپ کی چارپائی سے لگے بیٹھے رہے اور مستقل نماز ودعاؤں میں بھی مشغول رہتے۔ دونوں بچپن کے ساتھی اور ایک ہی شیخ کے خلیفہ رہتے اور ایک ساتھ ہی دین کی سربلندی کے لئے میدان جہاد میں سر سے کفن باندھ کر نکلے تھے۔ خارجی فتنے اور داخلی کمزوریوں کو دونوں نے ملت اسلامیہ سے دور کرنے کا فیصلہ لیا تھا اور آج دونوں ایک دوسرے سے جدا ہورہے تھے۔

وفات وتدفین:۔ ۴ رجمادی الاول ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵ راپریل ۱۸۷۹ء کی تاریخ جمعرات

کے دن بعد نماز ظہر حجیت الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند اس جہان فانی سے رحلت فرما کر دارالبقاء کے لئے روانہ ہوگئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) آپ کے انتقال کی خبر پھیلتے ہی چاروں جانب صف ماتم بچھ گئی جس نے بھی یہ خبر سنی دھک سے ہوگیا۔ عقیدت مندوں اور جاں نثاروں میں کہرام مچ گیا سب کی آنکھیں اشک بار اور دل غمگین ہوگیا انتقال کے وقت آپ کی عمر ۴۹ سال تھی۔

حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی نے ایک قطعہ زمین خرید کر قبرستان کے لئے وقف کردی چنانچہ اسی موقوفہ زمین میں آپ کی قبر کی جگہ تجویز کی گئی اور نماز عصر کے وقت دارالعلوم دیوبند کے صحن میں جنازہ لاکر رکھ دیا گیا مگر نماز جنازہ میں شریک لوگوں کی کثیر تعداد کے لحاظ سے یہ جگہ تنگ پڑ گئی تھی اس لئے قصبہ کے باہر میدان میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور بعد نماز مغرب تدفین ہوئی۔

<u>مرثیے اور تعزیتی تحریریں</u>:۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے سانحۂ انتقال پر ملال سے متاثر ہوکر بعض جلیل القدر مشائخ، علماء، دانشور اور ممتاز اہل علم حضرات نے اپنے دلی تاثرات پر مختلف طریقوں سے اظہار فرمایا تھا جس میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی جو آپ کے بچپن کے دوست تھے اور انتقال کے وقت آپ کی چارپائی سے لگے بیٹھے تھے اور جب آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تو آپ نے جو کچھ کہا وہ آپ کے دلی درد و کرب کا غماز ہے آپ نے فرمایا کہ "اگر وہ بات نہ ہوتی تو میں مولانا کے صدمے کا تحمل نہیں کرسکتا تھا بلکہ مر جاتا۔" شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی وغیرہ نے اردو فارسی اور عربی زبانوں میں دردناک مرثیے لکھے اور اپنے دلی جذبات واحساسات اور شدت درد و کرب کی ترجمانی کی۔ مولانا قاسم نانوتوی کے انتقال پر اس وقت کے سب سے بڑے قومی مصلح اور مسلمانوں کی تعلیمی ومعاشی ترقی کے روح رواں جناب سرسید احمد خاں نے جو تعزیتی

تحریر لکھی وہ مولانا کے تبحر علمی اوران کی قومی، ملی اور تعلیمی اور مذہبی خدمات کا بہترین اعتراف ہے۔ سرسید احمد خاں کی مذکورہ تعزیتی تحریر انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڈھ میں مورخہ ۲۴/اپریل ۱۸۷۹ء میں شائع بھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی اس زمانے کے بہت سارے لوگوں نے نثری اور شعری پیرائے میں آپ کے انتقال پر اپنے دلی درد وغم کا اظہار کیا تھا۔

اولاد واحفاد: — مولانا محمد قاسم نانوتوی کی شادی دیوبند کے رئیس شیخ کرامت حسین صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ آپ انتہائی شریف النفس اور صابروشاکر خاتون تھیں۔ آپ ایک اچھی منتظم، امورخانہ داری میں ماہر، تنگ دستی میں بھی عزت وآبرو کی محافظ اور فارغ البالی میں سخاوت وفیاضی کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ آپ سے کل دس اولادیں ہوئیں جن میں تین لڑکے اور سات لڑکیاں تھیں۔ (۱) رفیعہ (۲) خدیجہ (۳) مریم (۴) عائشہ (۵) اکرام النساء (۶) نام معلوم نہیں (۷) نام معلوم نہیں۔ لڑکوں میں (۱) حافظ محمد احمد (۲) محمد ہاشم (۳) محمد میاں۔

محمد میاں کا بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔ محمد ہاشم نے عنفوان شباب میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی صرف حافظ محمد احمد باحیات رہے جس سے آپ کا خاندانی سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ موصوف ریاست حیدرآباد میں ایک معزز عہدہ پر فائز رہے۔ دارالعلوم دیوبند میں عرصہ دراز تک مہتمم رہے آپ کے تین صاحبزادے تھے۔ (۱) مولانا قاری محمد طیب (۲) مولانا محمد طاہر اول (۳) مولانا محمد طاہر ثانی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے اخلاف میں مسلسل اہل علم پیدا ہوتے رہے ہیں۔

گفتار وکردار کی یکسانیت: — مولانا محمد قاسم نانوتوی انیسویں صدی عیسویں میں برصغیر ہندوپاک میں تحریک ولی اللہی کے سب سے بڑے حامی اور علمبردار تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کو اپنا ہیرو اور پیشوا مانتے تھے اور قلبی تعلق اور عقیدت واحترام کے سبب زبان ودل سے ان کے اوران کے خاندان کے دوسرے بزرگوں کی زندگیوں کو نمونہ تصور کرتے تھے اس لئے خود کو

بھی اسی سانچے میں ڈھال دیئے تھے چنانچہ ولی اللٰہی خاندان کے بزرگوں میں شاہ اسماعیل شہید کی تحریک نکاح بیوگان کے سلسلے میں دونوں کی فکر اور طریقۂ کار میں بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے اور دونوں کو اس معاملہ میں تقریباً یکساں حالات کا بھی سامنا کرنا پڑا جو تھا جو دلی تعلق اور ہم آہنگی کا ثبوت ہے۔

ضلع سہارنپور کا قصبہ دیوبند کے شیوخ برادری کا مرکز رہا ہے اس برادری مین اپنی برادرانہ عظمت اور برتری کا احساس ہمیشہ سے جاگزیں رہا ہے چنانچہ اس معاملے مین پوری برادری پر برہمنیت کے برادرانہ اثرات پائے جاتے تھے۔ ہندوستانی برہمنوں کی طرح یہاں کے شیوخ میں بھی بیوہ کی شادی سماجی شان وشوکت کے خلاف تصور کی جاتی تھی اور بیوہ کی شادی مصنوعی خاندانی شان کے خلاف سمجھی جاتی تھی۔ مولانا نکاح بیوگان کے زبردست حامی اور مبلغ تھے اور اس سلسلے میں اکثر وعظ بھی فرمایا کرتے تھے۔ آپ کی یہ اصلاحی کوششیں چل ہی رہی تھیں کہ آپ کی ہمشیرہ جو عمر میں آپ سے کافی بڑی تھیں بیوہ ہوگئیں جس کا تذکرہ مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم کی زبانی یوں ہے کہ ''حضرت نانوتوی محلہ دیوان میں نکاح بیوگاں پر وعظ فرما رہے تھے کہ اثناء وعظ میں شیوخ میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت! مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ حضرت انداز سے سمجھ گئے کہ وہ بطور اعتراض میری بہن کی بیوگی اور عدم نکاح کا ذکر کریں گے۔ فرمایا آپ ذرا ٹھہریں مجھے ایک ضرورت پیش آگئی ہے۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں یہ کہہ کر حضرت وعظ کی چوکی سے اترے اور گھر میں تشریف لے گئے۔ مجلس اپنی جگہ جمی رہی۔ گھر میں پہونچ کر اپنی بہن سے جو عمر میں بڑی تھیں اور کافی ضعیف ہو چکی تھیں پیر پکڑ کر لجاجت سے عرض کیا کہ آپ کی ایک ہمت سے ایک سنت رسول زندہ ہوتی ہے اور میں احیاء سنت کے قابل ہوسکتا ہوں۔ بہن نے گھبرا کر کہا بھائی! ایسی کیا بات ہے میرے پیر تو چھوڑو، مین کہاں اس قابل کہ کسی سنت رسول کے احیاء کا سبب بنوں۔ فرمایا کہ آپ نکاح کر لیں اس بہن نے کہا

بھائی! تم دیکھ رہے ہو میں ضعیف ہو چکی ہوں، سر سفید ہو چکا ہے، نکاح کی عمر نہیں ہے۔ فرمایا یہ سب صحیح ہے مگر یہ نکاح فقط عقد بیوگاں کے سنت کے احیاء کے لئے ہو گا کسی طبعی ضرورت کے بنا پر نہیں۔ اس بات پر بہن راضی ہو گئیں۔ اسی وقت گھر ہی میں حضرت نے نکاح پڑھایا اور نکاح سے فارغ ہوتے ہی باہر تشریف لائے۔ مجلس وعظ اسی طرح جمی ہوئی تھی، حضرت نے بقیہ وعظ فرمایا۔ معترض تو اعتراض کی ٹھانے ہوئے تھے، پھر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ مجھے یہ کہنا ہے کہا آپ تو نکاح بیوگاں کا وعظ فرما رہے ہیں اور آپ ہی کے گھر میں آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہوئی ہیں۔ فرمایا کون کہتا ہے کہ وہ بیٹھی ہیں۔ ان کے نکاح کے گواہ تو اسی محفل میں موجود ہیں چنانچہ گواہوں نے گواہی دی کہ ان کا نکاح ہماری موجودگی میں ہوا ہے اس سے تمام جلسہ متاثر ہوا اور اسی مجلس میں تقریباً پچاس ساٹھ نکاح ہوئے اور پھر یہ تحریک نہایت قوت سے آگے بڑھی۔'' (حاشیہ سوانح قاسمی۔ مناظر احسن گیلانی جلد دوم صفحہ ۱۴)

ٹھیک اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ مولانا اسماعیل شہیدؒ پھلت ضلع مظفر نگر میں عقد بیوگاں پر تقریر فرما رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ غلط رسم ہندوؤں سے مسلمانوں میں آگئی ہے اور جس طرح ہندو برہمنوں میں بیوہ کی شادی نہیں ہوتی تھی مسلمانوں میں بھی یہی برہمنیت داخل ہو گئی ہے چنانچہ تقریر کے دوران ہی ایک صاحب بڑے کروفر سے اٹھے اور سینہ تان کر کہا کہ مولانا مجھے آپ سے ایک سوال کرنا ہے۔ آپ سمجھ گئے کہ یہ مسلمان برہمن کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ آپ نے اس کا اعتراض سنے بنا کہا کہ میں کچھ دیر بعد آپ کی بات سنوں گا۔ اسٹیج سے اترے اور پھلت سے سیدھے گھر دہلی چلے گئے اور گھر جا کر اپنی بہن کے قدموں پر اپنا عمامہ اتار کر ڈال دیا اور کہا کہ ''اگر آپ چاہتی ہیں کہ اسماعیل وعظ کہے تو آپ میری بات منظور کر لیجئے ورنہ میں وعظ نہیں کر سکتا، انہوں نے حیرانی سے اصل بات جاننی چاہی تب مولانا نے عرض کیا کہ آپ کا عقد نہ ہونے کے سبب میرا وعظ بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے

انکی بہن بھی کافی ضعیف ہو چکی تھیں اور بیمار بھی رہا کرتی تھیں لیکن انہوں نے حضرت کی بات مان لی اور اسی وقت نکاح مولانا عبدالحئی سے ہو گیا جو اتفاق سے پھلت کے ہی رہنے والے تھے اس طرح شاہ اسماعیل شہیدؒ پھلت کے چھپے ہوئے اعتراض کا جواب عملاً دیکر پھلت میں اپنی نکاح بیوگاں کی تحریک کو جاری رکھا۔

ہندو برہمنوں کی دیکھی دیکھا مسلمان جاگیرداروں اور زمینداروں نے بھی لڑکیوں کو وراثت میں انکے حقوق سے عملاً مرحوم کرر کھا تھا جس سے شرعی قانون وراثت کی تردید ہوتی تھی۔ مولانا نانوتوی کی مجلس میں ضلع مظفرنگر کے قصبہ جلال آباد کا ذکر آیا کہ وہاں کے لوگ وراثت میں لڑکیوں کا حق نہیں دیتے تو آپ نے پہلے اس کی تصدیق کی اور جب یقینی طور پر یہ بات سامنے آگئی تو آپ نے ان کے خلاف زبردست مہم چلائی اور وہاں کے مسلمانوں کی زمینوں کو خریدنا شرعاً ناجائز قرار دیا۔ اسی طرح لڑکیوں اور عورتوں پر ہونے والے دیگر مظالم کے خلاف بھی آپ نے مولانا مظفرحسین کاندھلوی اور مولانا مملوک علی کی لڑکیوں کو انصاف دلانے کی تحریک کو پھر سے زندگی بخشی۔ اس کے علاوہ بھی مسلم سماج میں ہندوؤں کی دیکھی دیکھا جو غلط رسمیں رائج ہوگئی تھیں ان کی اصلاح کر کے ایک صالح اسلامی معاشرے کی تشکیل میں زندگی بھر لگے رہے اور اس میدان میں اہم اور نمایاں کارنامے انجام دیئے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی کی پوری حیات مذہب اسلام سے سر بلندی، مسلمانوں کی اصلاح شریعت وعقیدہ کا احیاء اور اسلامی تہذیب وثقافت کے تحفظ میں گذری وہ جانتے تھے کہ انگریز اور انگریزیت دونوں ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے خطرناک ہیں اس لئے انہوں نے ہر موقع پر اور ہر محاذ پر انکے خلاف خود کو سینہ سپر رکھا اور اپنے شاگردوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جو ہندوستان میں انگریزوں کو دیش نکالا دینے میں ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے ہمہ وقت تیار رہیں چنانچہ انہوں نے ایک ایسا ذریعہ اپنایا جس سے ہندوستانی مسلمان اپنے مذہب و

اخلاق کا تحفظ بھی کر سکیں اور اندلس وغرناطہ اور اسپین کی طرح ہندوستان میں انگریز ان کا مذہبی اور تہذیبی تشخص کے خاتمے میں بھی کامیاب نہ ہو سکیں چنانچہ ان کے یہ مقاصد بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے اور یہ آپ کی تحریک میں خلوص وللّٰہیت کی بدولت ہی ممکن ہو سکا ہے۔

باب دوم
نگارشات وتالیفات

☆مکتوبات نانوتوی ☆آب حیات

☆تحفہ لحمیہ ☆مباحثہ شاہ جہاں پور

☆اسرارِ قرآنی ☆اجوبۂ اربعین (اردو)

☆الحق الصریح ☆واقعہ میلہ خدا شناسی (گفتگوئے مذہبی)

☆توثیق الکلام ☆قصائد قاسمی

☆انتصار الاسلام ☆حاشیہ بخاری شریف (عربی)

☆جواب ترکی بہ ترکی ☆مصابیح التراویح

☆قبلہ نما ☆جوابات محذورات عشر

☆حجۃ الاسلام ☆انتباہ المومنین (فارسی)

☆ہدایت الشیعہ ☆مکاتب قاسم العلوم (فارسی)

☆تقریر دلپذیر ☆الخط المقسوم من قاسم العلوم (عربی)

☆تحذیر الناس

نگارشات وتالیفات

جب کسی قوم کے ہاتھوں سے اقتدار چھن جاتا ہے تو اس قوم کی ساری کمزوریاں اور خامیاں یکایک ابھر کر سامنے آجاتی ہیں کیوں کہ معاشیات سے حکومت کا رشتہ کافی مضبوط ہوتا ہے اور جب حکومت جاتی ہے تو معاشی ڈھانچہ بھی شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے گویا سیاسی شکست معاشی شکست کا باعث ہوتی ہے اور سیاسی و معاشی شکست سے اخلاقی شکست کو راہ ملتی ہے چنانچہ اٹھارہویں صدی میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ایسا ہی کچھ دیکھنے میں آیا اور انیسویں صدی میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی مکمل شکست میں ایسا ہی کچھ دیکھنے میں آیا تھا۔

ہندوستان میں مغرب کے ہاتھوں جب مسلمانوں کی شکست ہوئی تو ہندوستانی مسلمانوں پر سب سے بڑی جو افتاد پڑی وہ معاشی بدحالی تھی۔ مغرب کے سامراجی نظام کے ہاتھوں ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا جس تعلقہ داری، جاگیرداری اور امرائی سب کچھ خاک میں مل چکی تھی۔ مغلوں کے نظام میں مدارس کے فارغین کو جو قاضی وغیرہ کے منصب ملتے تھے وہ سب کے سب ختم کر دیئے گئے۔ انتظامی امور کی سرکاری ملازمتیں بھی ختم کر دی گئی تھیں انگریزی عدالتوں اور انگریزی دفاتر میں مسلمانوں کے لئے کوئی جگہیں نہیں رہ گئی تھیں سرکاری ملازمت کے لئے حکومت کی زبان اور مغربی علوم کا سیکھنا ضروری ہو گیا تھا اور اس پر بھی نچلی سطح کی ہی ملازمت کے امکانات تھے کیونکہ انتظامی امور کے کلیدی عہدوں پر انگریز ہی فائز ہوتے تھے۔

ہندوستانی مسلمان سیاسی اور معاشی اعتبار سے تباہ ہو چکے تھے مگر ان کے اندر ابھی قدرے ذہنی اور فکری توانائی باقی تھی کیوں کہ ان میں ایسی شخصیات موجود تھیں جو انکی بروقت ذہنی اور فکری رہنمائی کی بھرپور اہلیت رکھتی تھیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید احمد کا شمار ایسی ہی عبقری شخصیات میں ہوتا ہے کیوں کہ ان دونوں حضرات نے اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے مصیبت کی اس

جان لیوا گھڑی میں ہندوستانی مسلمانوں کی دست گیری کی اہم ذمہ داری نبھائی اور مسلمانوں کو کم سے کم اس مصیبت اور پریشانی کی حالت میں ذہنی اور فکری کنگالی سے بچانے کی قابل داد تاریخی خدمات انجام دیں جنہیں کسی بھی حال میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

انگریزوں نے ہندوستان میں جدید اور مغربی تعلیم کے نام پر جس طرح ہندوستانی تہذیب اور ثقافت اور تہذیب و تعلیم کو نگل جانے کی کوششیں کیں اسے مولانا قاسم نانوتوی نے پوری شدت سے محسوس کیا تھا اور اس کے تدارک کے لئے اپنے رفقاء کولیکر پوری طاقت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تھے انگریزی تہذیب و تعلیم عیسائیت کی بڑھتی یلغار جو دراصل انگریز حکمرانوں کی ایماں پر ہی ہورہی تھی اس کے علاوہ آریہ ساجی تحریک اور شدھی سنگھٹن جو ہندو مسلمان کو آپس میں لڑا کر انکے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے اوادے انہیں ہوا دی جاتی تھی تاکہ ہندوستان سے اسلام کا جنازہ نکال کر یہاں مسلمانوں کی صدیوں کی حکومت میں تشکیل پانے والی ہند اسلامی تہذیب کو ختم کرکے اسے اندلس واسپین بنادیا جائے مولانا محمد قاسم اور ان کے رفقاء انگریزوں کی اس چال کو بخوبی سمجھتے تھے لہٰذا ذہنی اور فکری یلغار کے ہر محاذ پر پورے عزم وحوصلے کے ساتھ سینہ سپر رہے اور انگریزوں کو فکری محاذ پر بہر حال کامیاب تو نہیں ہونے دیا۔

تعلیم و تعلم، درس و تدریس، اسکول و مدارس اور تعلیمی تحریک و اشاعت اور تصنیفی، تالیفی، نگارشاتی کام یقیناً اور دور میں مینارۂ نور ہوا کرتے ہیں اور انہیں سے قومیں بنتی بگڑتی اور سنورتی ہیں اور یہ کام ہر کسی کے بس کا کام بھی نہیں ہوتا ایسے ہی کاموں سے قوم وملت میں ذہنی اور فکری بیداری آتی ہے جو قوموں کی ذہنی اور فکری غلامی سے بچاتی ہے انگریزوں نے سیاسی اعتبار سے ہندوستان میں اپنا تسلط قائم کرکے اور معاشی اعتبار سے یہاں کے مسلمانوں کو تباہ حال بنا کر ذہنی اور فکری غلامی کا جو منصوبہ بنایا تھا مسلمان اکابرین اسے اچھی طرح سمجھ گئے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ سیاسی غلامی تو آنی جانی ہے مگر ذہنی اور فکری غلامی قوموں کی حیثیت کو فنا کردیتی ہے اسلئے

انہوں نے سوچا کہ سیاسی غلامی کے ساتھ اگر ذہنی اور فکری غلامی بھی مسلط ہوگئی تو پھر ہندوستانی مسلمانوں اور ان کے مذہب وتمدن کا بقاء ناممکن ہو جائیگا لہٰذا انگریزوں کے ذہنی اور فکری غلامی کے تسلط کے تمام خوابوں کو شرمندۂ تعبیر ہونے دینے کے لئے سینہ سپر ہوکر پوری توانائی سے ڈٹ گئے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تصانیف وتالیفات اگرچہ نئے موضوعات پر نہیں رہیں پھر بھی انکی یہ تصانیف وتالیفات ہندوستان میں صدیوں سے قائم ہمارے ذہن اور فکری تسلسل کے قابل فخر وراثت کی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے انکی اہمیت وافادیت مسلم ہے آپ کی تحریروں کا انداز بیان بالکل نیا ہے پیرایۂ اظہار ترتیب، مقدمات، دلائل وبراہین اور ثبوت وشہادت ہر جگہ آپ کی فکر رسا کی کارفرمائی ہے آپ نہ کسی کا تتبع کرتے ہیں اور نہ ہی دوسروں سے مستعار لئے گئے فکر وخیال سے کام لیتے ہیں آپ کی کتابوں میں سارے مسائل ونکات اور ان کی توضیحات آپ کی فکر جودت اور اخلاقی وروحانی صلاحیت کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ آپ کے مباحث کا انداز عالمانہ اور محققانہ ہونے کے ساتھ ساتھ متکلمانہ بھی ہوتا ہے۔ آپ کی تحریروں اور کتابوں میں علم کلام کی گہری چھاپ ہوتی ہے اور نئی اصطلاحات اور مخصوص الفاظ کی ترتیب سے بات اس قدر واضح اور آسان ہوجاتی ہے کہ اس کے سمجھنے اور سمجھانے میں کسی قسم کی کوئی دقت نہیں ہوتی گویا ترسیل وابلاغ کے رموز ونکات سے بھی آپ بخوبی واقف تھے۔ جس سے آپ کی نگارشات اور تحریرات میں ترسیلی اور ابلاغی توانائی کا احساس ہوتا ہے۔

مکتوبات نانوتوی:- مولانا محمد قاسم نانوتوی کے مکتوبات کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن ابتک ان کے مکتوبات کے بہت سے حصے شائع بھی نہیں ہوسکے ہیں۔ جبکہ مکتوبات اہم شخصیات کی افہام وتفہیم کا سب سے اہم اور بڑا وسیلہ ہوتے ہیں کیونکہ خارجی کارنامے اور نجی خطوط کی ہم آہنگی سے ہی کسی کے افکار وخیالات اور کارناموں میں انکی فکری ہم آہنگی، یکسانیت، خلوص اور

نیک نیتی کی ترجمانی کا پتہ ملتا ہے۔اس کے علاوہ شخصیت کی تعمیر وتشکیل کی نوعیت افکار ونظریات اور تصورات اخذ کرنے میں بھی مکتوبات ومراسلات کافی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اسلئے کسی اہم شخصیت کے ان عناصر وعوامل کی تحقیق وتلاش جو شخصیت کی زندگی کا اصل محور رہے ہیں خطوط بہت ہی کارآمد ذریعہ ہوتے ہیں۔

آپ کے ابتک جتنے مکتوبات شائع ہوئے ہیں ان کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ کے مکتوبات اپنے دور کی عام ڈگر اور رسمی طور طریقوں سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں کسی بھی مسئلہ پر غور وفکر۔عمیق مطالعہ اور تحقیق،تنقید کی روشنی میں مختصر اور چھوٹے چھوٹے موضوعات پر مشتمل ہوتے ہیں۔جن پیچیدہ اور اہم ترین مسائل میں لوگ آپ سے رجوع کرتے تھے ان کی وضاحت آپ بڑے سادہ اور سلیس انداز میں کردیتے تھے آپ کے خطوط بہت سے اہم ملی مسائل کے ترجمان ہیں اسلئے اگر ان سارے خطوط کو تلاش وجستجو اور پوری تحقیق کے ساتھ شائع کردئے جائیں تو آج بھی انکی افادیت مسلم ہے اور ملت کے بہت سے پیچیدہ مسئلوں اور نازک ترین بحثوں میں ذہنی گرہیں کھولنے کے لئے کافی ہیں آپ نے اپنے خطوط میں جن پیچیدہ ترین مسائل اور دشوار ترین سوالات کے دوٹوک جواب دیئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں آپ کے ابتک جو خطوط چھوٹے چھوٹے کئی رسالوں میں مختلف ناموں سے شائع ہو چکے ہیں ذیل میں انکا اجمالی تعارف تحریر کیا جاتا ہے۔

<u>**(الف) جمال قاسمی:۔**</u> یہ دراصل سولہ صفحات کا ایک مختصر ترین رسالہ ہے جو ایک طویل ترین خط پر مشتمل ہے اور اردو زبان میں ہے۔دہلی کے ایک بزرگ مولانا جمال الدین علوی نے حضرت نانوتوی سے صوفیاء کی اصطلاح وحدت الوجود اور سماع موتی کے بارے میں سوال کیا تھا اور اس کی نوعیت دریافت کی تھی آپ نے مذکورہ دونوں مسئلوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور پوری تشریح کے ساتھ وضاحت فرمائی ہے۔

(ب) مکتوبات قاسمیہ:- یہ مولانا نانوتوی کے چند مکتوبات کا مجموعہ ہے جو صرف تیرہ صفحات پر مشتمل ہے حضرت سے ایک صاحب بیعت تھے جو خلیفہ بشیر احمد دیوبندی کے نام سے جانے جاتے تھے اور محکمۂ بندوبست میں سرکاری ملازم تھے اور بسلسلہ ملازمت ضلع بجنور میں مقیم تھے وہ اپنے ذکر وشغل اور احوال وکیفیات بذریعہ خط آپ کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے اور حضرت کی طرف سے انہیں اوراد ووظائف کی ہدایات دی جاتی تھیں۔ قبض وبسط میں کچھ رہنمائیاں ہیں کسی خط میں وظیفہ کے بعض جملوں کے اضافہ کرنے کا ذکر ہے بشیر احمد کے نام ایسے آٹھ خطوط ہیں بقیہ ان کے ساتھ جو خطوط شائع کئے گئے ہیں ان میں بعض حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے ہیں جن کی صراحت بھی موجود ہے بقیہ خطوط بشیر احمد صاحب کے ان خطوط کے جواب میں ہیں جو انھوں نے حضرت نانوتوی کے سانحہ انتقال ۴ر جمادی الاول ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵؍اپریل ۱۸۷۹ء کے بعد دوسرے بزرگوں پر لکھے تھے اور ان کی جانب سے جو جوابات آئے تھے یہ مجموعۂ خطوط کتب خانہ قاسمیہ دیوبند نے شائع کیا تھا۔

(ج) فیوض قاسمی:- یہ بھی حضرت نانوتوی کے خطوط کا مختصر مجموعہ ہے جن میں کل پندرہ خطوط شامل ہیں لیکن یہ خطوط مفصل ہیں اسلئے چھپن صفحات پر محیط ہیں ان میں اکثر خطوط ایک مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں بعض اہم مسائل پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔ ان میں چھ خطوط اردو میں ہیں اور بقیہ فارسی میں ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شیعی مسائل بہت پائے جاتے تھے اس لئے زیادہ تر استفسارات شیعی مسائل وعقائد سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن مکتوب الیہ کا نہ کہیں نام ہے نہ کہیں پتہ نہ ہی خطوط پر تاریخ درج ہے اگر یہ تفصیلات بھی مکتوبات کے ساتھ درج ہوتیں تو اس کی اہمیت وافادیت میں مزید اضافہ ہو جاتا اور بہت سی گرہیں بھی کھل جاتیں ان میں نہ ہی مرتب کی طرف سے کوئی حاشیہ ہے اور نہ ہی کسی اور طرح کی وضاحت ہے۔

مذکورہ مکتوبات میں جن موضوعات ومباحث پر کلام کیا گیا ہے اور محققانہ بحث کی گئی ہے وہ اس طرح ہیں۔(۱) شیعہ مسلمان ہیں یا کافر؟ انکی عورتوں سے شادی اور انکے ذبیحوں کا کیا حکم ہے (۲) زیارت قبور خصوصاً عورتوں کے بارے میں حکم (۳) مسائل اہل بیت پر رونے کا حکم (۴) واقعات کربلا کا بیان (۵) ذوالفقار کیا ہے (۶) وراثت نبوی (۷) شفاعت اہل بیت خصوصاً خلفائے ثلاثہ کے متعلق کے سوالات کا تحقیقی جواب (۸) حیات النبیؐ (۹) فعلی مولاۃ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے متعلق حضور اکرم کی اس حدیث کی تشریح (۱۰) فدک کا مسئلہ (۱۱) دیہات میں جمعہ (جمعہ فی القریٰ کے نام سے اس مکتوب کے مضمون کا ترجمہ کر کے احکام الجمعہ کے نام سے الگ سے بھی شائع کیا گیا ہے) (۱۲) قصور شیخ (۱۳) بعض احکام امور شرعیہ کے اسرار وحکمت (۱۴) یزید کا کفر وایمان (۱۵) نذر غیر اللہ (۱۶) نمازوں میں قرأت (۱۷) بدعت وسنت (۱۸) مسئلہ علم غیب (۱۹) نفس کیا ہے (۲۰) حضرت عمر فاروق پر ایک الزام کا تحقیقی جواب۔

(د) لطائف قاسمی:- یہ بھی مکتوبات کا مختصر سا مجموعہ ہے جو ۲۸ صفحات پر محیط ہے اس میں کل ۹ خطوط شامل ہیں جس میں ایک خط مولانا رشید احمد گنگوہی کا بھی ہے بقیہ ۸ خطوط مولانا نانوتوی کے ہیں اس میں ایک خط جو سب سے طویل ہے وہ جمعہ فی القریٰ کے مسئلہ پر ہے کتاب کے آخر میں مولانا نانوتوی کی ایک فارسی نعت ہے۔

اس مجموعۂ مکاتب میں جو موضوعات زیر بحث آئے ہیں وہ یہ ہیں (۱) مسئلہ حیات النبی (۲) تراویح (۳) دیہات میں جمعہ (۴) علم دین کی اہمیت (۵) رہن اور سود۔

(ر) تصفیۃ العقائد (اردو):- یہ ایک طویل خط ہے جو سر سید احمد خاں کے اس خط کے جواب میں ہے جس میں سر سید احمد خاں نے اپنے بعض عقائد ونظریات کی وضاحت کی ہے۔ چنانچہ اس خط میں سر سید احمد خاں کے عقائد ونظریات کا اسلامی نقطۂ نظر سے تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا

ہے۔

تحفۂ لحمیہ:- یہ بارہ صفحات کا مختصر رسالہ ہے جس میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر گوشت خوری کے سلسلے میں الزامات عائد کئے گئے ہیں۔ مذکورہ رسالہ میں انھیں الزامات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔

اسرار قرآنی:- اسرار قرآنی بھی ایک مختصر سا رسالہ ہے جس میں کل بیس صفحات ہیں مولانا محمد صدیق مرادآبادی نے تفسیری سلسلے کے کچھ سوالات لکھ کر ان کے جوابات دریافت کئے تھے۔ اور مولانا نانوتوی نے بذریعہ خط ان اشکال کو رفع کئے تھے چنانچہ اس رسالہ میں آپ نے ان تمام سوالات کے جواب دئے ہیں اور پوری تفصیل سے اسرار وحکمت بھی بیان کئے ہیں۔ اس رسالہ میں بعض دوسرے مکتوبات میں قرآن سے متعلق سولات ہیں۔

الحق الصریح:- یہ سولہ صفحات کا رسالہ ہے جس میں بیس رکعت تراویح پر ایک مدلل مضمون مولانا نانوتوی کا ہے جو کتاب کے آٹھ صفحات پر محیط ہے تراویح کے موضوع پر یہ خط کی شکل لطائف قاسمیہ میں بھی شائع ہو چکا ہے مگر یہاں ایک مستقل رسالہ کی حیثیت سے شائع ہوا ہے۔

توثیق الکلام:- یہ سولہ صفحات کا رسالہ ہے جس کا پورا نام توثیق الکلام فی انصات خلف الامام ہے۔ اس رسالہ میں قرأت خلف الامام کا مشہور اور مختلف فی مسئلہ زیر بحث ہے۔ اس سلسلہ میں آیات قرآنی اور روایات سے استدلال کیا گیا ہے انداز بحث متکلمانہ ہے۔ ترتیب مقدمات، اصطلاحات، علم الکلام کا استعمال اور استخراج کا وہی اسلوب ہے جو متکلمین کے یہاں ہوتا ہے آیتوں اور روایتوں میں تطبیق اور ہر ایک کا محل دلائل کی روشنی میں متعین کیا گیا ہے۔

انتصار الاسلام:- یہ چھپن صفحات پر مشتمل ایک مختصر سی کتاب ہے جو وفات سے دو سال قبل ۱۲۹۵ھ میں تصنیف ہوئی تھی۔ کتاب کا نام آپ کے شاگرد رشید مولانا فخر الحسن گنگوہی نے "انتصار لاسلام" تجویز کیا تھا۔ یہ کتاب آریہ سماج کے بانی دیانند سرسوتی کے ان سوالات کا

جواب ہے جوانھوں نے اسلام اور مسلمانوں پر مجمع عام میں لگائے تھے یا اپنی تحریروں میں قلم بند کیے تھے۔ حضرت نانوتوی کی تمام امکانی کوششوں کے باوجود پنڈت جی مجمع عام میں مباحثہ کے لئے نہ رڑکی میں تیار ہوئے اور نہ سال بھر بعد میں میرٹھ میں ہی سامنے آسکے۔ جب کہ مولانا نانوتوی اپنی شدید علالت کے باوجود خود چل کر دونوں مقامات پر پہونچے تھے لیکن پنڈت جی نے ان دونوں مقامات پر جو زہریلے بیانات دیئے تھے وہ عام مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت تھے اس لئے مولانا نانوتوی نے عوامی تقریروں میں پنڈت جی کے الزامات کی بھرپور تردید کی تھی۔ چنانچہ اعتراضات کے انھیں جوابات کو کتابی شکل میں شائع کردیا تھا تاکہ دوسروں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوسکیں۔

پنڈت جی کے سوالات بالکل نئے انداز کے تھے اسلئے ان مسائل پر عام علماء کیلئے بطور دلیل راہ آپ نے دو کتابیں تحریر کی تھیں جس میں ایک تو یہی ''انتصار الاسلام'' ہے۔ کتاب کے آغاز میں مولانا فخر الحسن گنگوہی نے وہ تمام واقعات بیان کردیئے ہیں جو رڑکی میں پیش آئے تھے اور جس طرح سے پنڈت جی نے خلفشار برپا کردیا تھا اور جس طرح کے طوفان آئے تھے اور انکی وجہ سے عوام میں جو بے چینیاں تھیں انکا اس کتاب میں تذکرہ موجود ہے۔ چار افراد پر مشتمل دیوبند کے علماء کا جو وفد رڑکی گیا تھا اور اس وفد سے پنڈت جی کی جو گفتگو ہوئی تھی اور مجمع عام میں مباحثہ سے پنڈت جی نے کن کن طریقوں سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور بالآخر مباحثہ عام کے لئے کسی بھی صورت میں تیار نہیں ہوئے تھے اس کے علاوہ آریوں اور سناتن دھرمیوں کی طرف سے اخباروں اور رسالوں میں جو گیارہ اعتراضات کئے گئے تھے ان کے جوابات اس کتاب میں موجود ہیں۔ گیارہواں اعتراض جو مسلمانوں کے استقبال قبلہ سے متعلق تھا اور جس کو ان لوگوں نے بت پرستی کے لفظ سے تعبیر کیا تھا حضرت نانوتوی نے اس ایک سوال کا جواب مستقل دوسری کتاب ''قبلہ نما'' کے نام سے الگ کتاب تصنیف کرکے دیا تھا۔

''انتصارالاسلام'' میں جن سوالات کے جوابات دیئے گئے وہ درج ذیل ہیں (۱) قدرت قادرالمطلق سے متعلق (۲) شیطان کے بہکانے سے متعلق (۳) احکام میں نسخ سے متعلق (۴) تحقیق روح جس کے تحت تعداد ارواح اور تناسخ کی بحث بھی ہے (۵) افطار وصوم کے اجر بصورت حوران جنت سے متعلق (۶) توبہ کے تحت گناہوں سے معافی (۷) جانوروں کی حلت و حرمت سے متعلق (۸) حرمت شراب سے متعلق (۹) زمین کے اندر میت دفن کرنے سے متعلق (۱۰) قیام قیامت اور تناسخ سے متعلق اعتراضات کے شافی اور متکلمانہ انداز میں جوابات شامل ہیں۔

جواب ترکی بہ ترکی:- یہ کتاب ایک آریہ سماجی لالہ اندلال کے رسالہ آریہ سماچار کے اعتراضات کے جواب میں ہے۔ آریوں کا یہ رسالہ میرٹھ سے شائع ہوتا تھا اور جسکا واحد مقصد اسلام اور مسلمانوں پر اعتراضات کرنا تھا۔ پنڈت دیانندسرسوتی بانی آریہ سماج کا ترجمان تھا۔ پنڈت جی نے رڑکی کے بعد میرٹھ کو اپنا مستقر بنایا تھا اور جارحانہ انداز میں اسلام کو نشانہ بنا رکھا تھا چنانچہ ان کا منھ بند کرنے کے لئے مولانا نانوتوی کو میرٹھ جانا پڑا تھا۔ ان کی جگہ لالہ اندلال نے سنبھال رکھی تھی اور اپنے اس رسالہ میں زہر میں بجھے ہوئے الفاظ اسلام اور قرآن سے متعلق استعمال کرتے تھے اسلئے ضرورت تھی کہ ان کے بے بنیاد اعتراضات پر روک لگائی جائے لیکن اس وقت مولانا نانوتوی کی صحت خطرناک دور سے گزر رہی تھی۔ بیماری کا سلسلہ طویل ہوتا جارہا تھا اور خود قلم سے لکھنا دشوار ہوگیا تھا چنانچہ آپ کے شاگرد رشید عبدالعلی میرٹھی نے ترتیب مضامین کی ذمہ داری لی۔ سوالات کے جوابات حضرت نانوتوی بولتے تھے اور مولانا میرٹھی املا کرلیا کرتے تھے۔ مضمون اور سیاق وسباق کی ترتیب اور الفاظ مولانا میرٹھی کے تھے اس لئے اس کتاب کے مرتب کی حیثیت تو مولانا میرٹھی کی ہے البتہ افادات تمام کے تمام مولانا نانوتوی کے ہی ہیں چنانچہ اس کتاب کو بھی مولانا نانوتوی کی ہی کتابوں کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔

قبلہ نما:- یہ کتاب ایک سو چار صفحات پر مشتمل ہے جو دراصل حضرت نانوتوی کی کتاب ''انتصار الاسلام'' کا دوسرا حصہ ہے۔ آریوں کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں پر جو گیارہ اعتراضات کئے گئے تھے جس میں سے دس کے جوابات تو ''انتصار الاسلام'' نامی کتاب میں دیدئے گئے تھے مگر گیارہواں اور آخری سوال جو استقبال قبلہ سے متعلق تھا اس آخری اعتراض کے جواب میں ''قبلہ نما'' میں لکھی گئی تھی۔

آریوں کا ایک زبردست اعتراض یہ تھا کہ مسلمان ساری دنیا میں بت پرستی کے خلاف اعلان کرتے پھر رہے ہیں مگر وہ خود سب سے بڑے بت پرست ہیں کیونکہ ساری دنیا کے مسلمان خانہ کعبہ کی طرف منھ کر کے نماز پڑھتے ہیں یہ ایک ایسا اعتراض تھا کہ معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والے مسلمانوں کو بھی مغالطے میں ڈال سکتا تھا چنانچہ آپ نے اس کتاب میں اعتراضات کا مدلل نفسیاتی اور تاریخی شواہد کی روشنی میں ایسا جواب دیا تھا کہ کسی بھی اسلام مخالف کو آئندہ ایسے اعتراضات کی ہمت نہیں پڑ سکتی۔

حجۃ الاسلام:- یہ اڑتالیس صفحات کا ایک رسالہ ہے۔ لیکن کوزے میں دریا کے سمونے کے مصداق ہے۔ اسلام کی حقانیت اور دوسرے ادیان وملل کی تردید۔ اسلام پر عائد کئے جانے والے اعتراضات، دوسرے مذاہب کے مشرکانہ اعتقادات، خلاف عقل ونقل رسومات وعبادات غرض کہ تمام پہلوؤں پر نہایت اختصار کے ساتھ مگر جامع مدلل بحث کی گئی ہے۔

ہدایۃ الشیعہ:- حضرت نانوتوی کے زمانے میں شیعی افکار وخیالات کی بہتات تھی اور ہر آبادی کے سنی خاندانوں میں کچھ نہ کچھ لوگ شیعیت کے ہمنوا ہو گئے تھے اور سنیوں میں بھی بہت سے شیعی عقیدے رائج ہو گئے تھے جس کا مولانا نانوتوی نے مختلف جہتوں سے جائزہ لیا اور شیعی روایات کے بارے میں جو سوالات اٹھائے جا رہے تھے ان کا سد باب کیا۔ انھیں شیعی روایات میں خلفاء راشدین کو غاصب ثابت کرنے کے لئے فدک کا مسئلہ بھی زیر بحث آ جاتا تھا۔ شیعوں کا

کہنا تھا کہ حضور کی صحیح وارث حضرت فاطمہ تھیں جو وراثت کی دعویدار بھی تھیں اور فدک حضور کی خاص جاگیر تھی لہٰذا حضور کے اس دنیا سے جانے کے بعد انصاف کا تقاضہ یہی تھا کہ شرعی وارث حضرت فاطمہ کو فدک کا باغ دیدیا جاتا لیکن خلفاء راشدین نے جیسے مسند خلافت پر قبضہ کرلیا تھا اسی طرح حضور کی وراثت سے بھی حضرت فاطمہ کو محروم کردیا تھا۔

مولانا نانوتوی نے اس پورے معاملے پر مفصل اور سیر حاصل بحث کی ہے اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ حضور کے مال کا کوئی وارث ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ مالی وراثت کی تقسیم کا مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مورث کا انتقال ہو جائے اور وہ وفات پا جائے اور جب تک وہ زندہ ہے اس کی وراثت کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پہلے حضور کا ارشاد گرامی پیش کیا گیا کہ لا نورث ماترکنا ہ صدقه اور اس سے استدلال کیا ہے اور پھر آپ نے یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ قبر انور میں حیات اور جب آپ حیات سے ہیں تو ان کی ازواج مطہرات کو دوسروں سے نکاح کرنا جائز نہیں اور نہ آپ کے متروکہ سامان کو بہ حصص تقسیم کرنا درست ہے۔ پھر اس کو عقلی دلیل سے مدلل اور مبرہن کیا ہے۔ ''ہدایۃ الشیعیہ'' بعد ایک دوسری کتاب ''حیات نبوی'' کے موضوع پر ''آب حیات'' کے نام سے تصنیف فرمائی ہے جو الگ سے شائع ہوئی تھی اور جسے اس کتاب کا دوسرا حصہ کہنا زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔

تقریر دل پذیر: – یہ ایک مستقل تصنیف ہے جو دعوت اسلام کے نقطہ نظر سے تصنیف کی گئی ہے اور ساری دنیا کو دلائل و براہین کی روشنی میں اسلام کی دعوت دی گئی ہے اس کتاب کے مخاطبین صرف دیگر ادیان وملل کے ماننے والے ہی نہیں ہیں بلکہ ملحدین اور دہریئے بھی ہیں ان کے سامنے حق کی روشنی کو پیش کیا گیا ہے اور انھیں راہ ہدایت دکھائی گئی ہے۔ انکی عقل سلیم سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ پہچانیں کی حق کیا ہے اور باطل کیا ہے اور سچ وجھوٹ، میں تمیز کریں۔

تحذیر الناس: – یہ کتاب ایک استفتا کے جواب میں لکھی گئی ہے اور چالیس صفحات پر مشتمل

ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے اہل علم میں مذکورہ استفتا کا کافی چرچا تھا اور اس دور کے مشاہیر علماء سے اس مسئلہ پر استصواب رائے بھی کیا گیا تھا کیونکہ اس میں مولانا عبدالحئ فرنگی محلی کا بھی جواب ہے اور ہم عصر دیگر علماء کی بھی تصادیق تصویبات بھی شامل ہیں۔ یہ استفتا حضرت نانوتوی کی خدمت میں آپ کی رائے جاننے کے لئے بھیجا گیا تھا اس لئے آپ نے درج شدہ مسئلہ پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور پھر اسی تفصیلی جواب کو دوسرے علماء کی خدمت میں تصدیق تصویب کے لئے بھیجا گیا تھا۔

استفتا میں عبداللہ بن عباس کا ایک ''اثر درمنثوا'' سے نقل کیا گیا تھا جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ خدا نے زمین کے ساتھ طبقات بنائے ہر ایک میں مخلوقات ہیں اور انکی ہدایت کے لئے پیغمبر بھی بھیجے گئے ہیں روایت کے الفاظ یہ ہیں ''ان اللہ خلق سبع ارضین فی کل أارض أدم کادمکم ونوحا کنوحکم وابراھیم کا براھیمکم وعیسیٰ کعیسی کم وبنی کنبیکم ''اس اثر کی روشنی میں رسول اللہؐ کے خاتم الانبیاء ہونے کے کیا معنی ہوئے؟ کیا آپ ہر طبقہ کیلئے خاتم ہیں یا صرف ایک طبقہ کیلئے؟ اگر ایک طبقہ کے خاتم ہیں تو دوسرے طبقات ارض میں بھی خاتم ہونگے پھر خاتمیت کے وصف میں فضیلت ہوئی؟ حقیقت واقعہ کیا ہے صحیح صورت مسئلہ کی وضاحت کی جائے۔

اس استفتاء کی اہمیت اس لئے بھی تھی کہ اس کا تعلق مسئلہ ختم نبوت سے تھا۔ قرآن میں رسول اللہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ'' ولکن رسول اللہ وخاتم النبین۔ ''اگر ہر طبقۂ ارض میں پیغمبر ہیں تو ہر طبقہ میں اس کے خاتم بھی ہوں گے تو پھر حضور اکرمؐ کے خاتم الانبیا ہونے کی فضیلت کہاں رہ جاتی ہے؟

چنانچہ حضرت نانوتوی نے گفتگو یہیں سے شروع کی کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ رسول اللہؐ سب نبیوں کے بعد آئے ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اس لئے آپ آخری نبی ہیں یعنی

ختم نبوت کا تعلق زمانہ کے اعتبار سے ہے۔ تمام انبیاء پہلے آئے اور سب سے آخر میں آپ ﷺ تشریف لائے اسی معنی میں آپ خاتم الانبیاء ہیں۔

آب حیات:۔اس کتاب کے بارے میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نے فرمایا ہے کہ ''میں نے اسے حضرت نانوتوی سے سبقاً سبقاً پڑھی۔'' یہ کتاب اردو زبان میں ہے اور شیخ الہند جیسے متبحر عالم کا سبقاً سبقاً پڑھنا کتاب کی مشکل ترین ہونے کا ثبوت ہے۔ اگر کوئی بڑا عالم جو حضرت نانوتوی کے طریقِ استدلال اور انداز تحریر کا اداشناس ہو۔ فلسفیانہ مباحث اور منطقانہ طرز استدلال کا شناسا ہو اور اس کتاب کو سبقاً سبقاً پڑھائے تو شاید اہل علم کو یہ بات سمجھ میں بھی آئے۔

اس کتاب کا موضوع مسئلہ حیات النبیؐ ہے۔ اب تک دنیائے اسلام میں اس موضوع پر اتنا مفصل کلام اور اتنے دلائل و تجربات، مشاہدات وشواہد کے ساتھ کسی عالم نے نہیں لکھا ہے۔ اس موضوع پر لکھنے کا داعیہ اس وقت پیدا ہوا جب آپ نے ''ہدایۃ الشیعیہ'' تصنیف فرمائی جس میں شیعوں کے مسئلہ فدک کے سلسلے میں خلفائے راشدین پر الزامات کی تردید کی گئی تھی۔ شیعوں نے حضرت فاطمہ کو فدک نہ دینے پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کو مطعون کرنا شروع کر دیا تھا تو متعدد علماء نے اس کے جواب دئے تھے۔

مذکورہ مسئلہ پر حضرت نانوتوی نے بالکل الگ نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے اور اس کا جواب دیا ہے کہ حضور کے ارشاد لا نورث ماترکناہ وصدقتہ سے استدلال کرتے ہوئے جو دلیل پیش کی ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ خود حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میری متروکات اللہ کی راہ میں صدقہ ہیں لہٰذا ان کو بطور وارث کوئی پانے کا حقدار نہیں اس لئے بحیثیت وارث کوئی اس کا دعویدار بھی نہیں ہوسکتا ہے اور نہ کوئی اسکا حقدار ہے۔ اسی ارشاد نبویؐ سے حضرت نانوتوی کا ذہن اس جانب منتقل ہوا کہ وارث کا مسئلہ اس وقت اٹھتا ہے کہ جب مورث وفات پاجائے اور

مورث جب تک زندہ ہے چاہے حالت نزع میں ہی کیوں نہ ہو مال اس کی ملکیت سے نہیں نکلتا ہے اور جب مالک اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو ورثاء مورث کے مال کے وارث ہوتے ہیں۔ حضور اکرمؐ کے مال کی وراثت اسلئے جاری نہیں ہوئی کہ آپ قبر مبارک میں زندہ ہیں اور زندہ کے مال میں وراثت جاری نہیں ہوسکتی اور شاید یہی وجہ ہے کہ ازواج مطہرات کا دوسروں سے نکاح بھی حرام ہوا۔ اور دوسرا نکاح شوہر کی وفات کے بعد ہوتا ہے جب تک زندہ ہے دوسرا نکاح حرام ہے۔ چونکہ حضورؐ باحیات ہیں اس لئے ازواج مطہرات کا نکاح دوسروں سے حرام رہا۔ ان حکایت کے پیش نظر آپ نے یقین کرلیا کہ ان دونوں مسئلوں میں علت حقیقی یہی "حیات نبویؐ" ہے اس لئے آپ نے ان مسئلوں پر دلائل فراہم کرنا شروع کر دیئے بہت سی احادیث میں اور قرآنی آیات سے آپکی نقطۂ نگاہ کی تائید ہوتی چلی گئی تو بعض ایسی پرانی آیات سے جو اسی کے برخلاف حقائق کی تائید کرتی تھیں آپ نے ان پر بھی غور وخوض فرمایا اور پھر ان کی توجیہ دتاویل کی۔

<u>مباحثہ شاہ جہاں پور:</u>۔ یہ کتاب دراصل اس مباحثہ کی روداد ہے جو ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۷ء میں عیسائیوں، آریوں، سناتن دھرمیوں اور مسلمانوں کے درمیان رونما ہوا تھا۔ پورے مباحثہ کی روداد آپ کے شاگرد رشید مولانا فخرالحسن گنگوہی نے مرتب کی ہے۔ کتاب میں مباحثہ کے ماحول، پس منظر اور حالات کے ساتھ ساتھ ہر فریق کے بیانات اور تقریروں کو بھی ضبط تحریر میں لایا گیا ہے اور مولانا نانوتوی کی مکمل تقریر قلمبند کر دی گئی ہے اس لئے یہ کتاب صرف مباحثہ کی روداد ہی نہیں بلکہ مولانا نانوتویؒ کے علمی جواہرات کا مجموعہ بھی ہے اس کتاب میں آپ کی لمبی لمبی تقریریں من وعن آپ ہی کے الفاظ میں نقل کی گئی ہیں جس سے مولانا نانوتوی کے علم وفن، طرز استدلال اور اثبات مدعا کے لئے مقدمات کی ترتیب اور اس سے نتائج کا حیرت انگیز مظاہرہ ہوتا ہے اور چونکہ تمام تقریریں برجستہ کی گئی ہیں اس لئے زور کلام کے ساتھ زور بیان کا بھی

بہترین نمونہ تو ہیں ہی آپ کے علوم معارف کا نادر گنجینہ بھی ہیں۔

اجوبۂ اربعین (اردو):- یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے اور شیعہ حضرات کے چالیس سوالوں پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا حصہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولوی عبید اللہ انبیٹھوی کی مشترکہ تصنیف ہے جبکہ دوسرا حصہ صرف آپ کا تصنیف کردہ ہے۔

واقعہ میلہ خداشناسی (گفتگوئے مذہبی) اردو:- ۱۲۹۳ھ میں شاہ جہاں پور میں جو پہلا مناظرہ ہوا تھا دراصل یہ کتاب اسی کی رپورٹ ہے جو حصول دین کی حقانیت کے بیان پر مشتمل ہے۔ منشی محمد ہاشم صاحب مالک مطبع ہاشمی اور مولوی محمد حیات صاحب مالک مطبع ضیائی نے ترتیب دیکر شائع کی ہے جس میں حضرت نانوتوی کی تقریر پیش کی گئی ہے۔

قصائد قاسمی:- یہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی شعری تصنیف ہے جس میں ان کے اردو، عربی اور فارسی کے قصائد شامل ہیں جیسے قصیدۂ بہاریہ، شجر طریقت اور دیگر مدحیہ قصائد شامل ہیں اس کتاب سے مولانا موصوف کے شعری ذوق، تخلیقی رویوں اور ان کی شعری وفنی صلاحیت کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ موصوف جہاں بلند پایہ عالم دین، مناظر اور صاحب طرز ادیب ومصنف تھے وہیں عظیم المرتبت شاعر بھی تھے۔

حاشیہ بخاری شریف (عربی):- حضرت مولانا محمد علی صاحب محدث سہارنپوری کا بخاری شریف کا حاشیہ جو عام طور پر دستیاب ہے اس کے آخری پانچ پاروں کا حاشیہ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے تحریر فرمایا تھا جو آج بھی اپنی اہمیت وافادیت کے سبب مقبول ہے۔

مصابیح التراویح:- اس کتاب کے نام سے ہی اس کا موضوع ظاہر ہے لیکن ضمناً دوسرے مضامین بھی زیر تحریر آگئے ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ مولانا محمد اشتیاق احمد دیوبندی نے تحریر فرمایا ہے جو انوار المصابیح کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

جوابات محذورات عشر:- یہ کتاب (مناظرۂ عجیبہ اردو) تحذیر الناس اعتراضوں کے

جوابات۔ مولانا عبدالعزیز صاحب کے اعتراضوں کے جوابات اور طرفین کی مراسلات پر مشتمل ہے مولانا کے جوابات برائے مخالفت نہ ہوکر برائے تحقیق تھے اس سے اس کتاب کی اہمیت بھی بڑھ گئی تھی اور حضرت نانوتوی کے جواب سے مولانا مطمئن بھی ہو گئے تھے۔

اعتباہ المومنین (فارسی):- یہ کتاب حدیث شریف شرح، مشکوٰۃ شریف باب مناقب العشرہ فصل ثابت میں حضرت علیؓ کی حدیث حضور پاکؐ کے خلفاء کے بارے میں ہے اور اسی کی شرح میں دو مکتوب کا مجموعہ یہ کتاب ہے۔

مکاتب قاسم العلوم (فارسی):- نمبر اول، دوم، سوم اور چہارم اس کے کل چار نمبر شائع ہوئے ہیں جو گیارہ مکاتب پر مشتمل ہیں جن میں دس مکتوب حضرت علیؒ کے ہیں۔(۱) قریہ فدک کی بحث (۲) حدیث عما کی شرح (۳) مااہل بہ لغیر اللہ کی تحقیق (۴) عصمت انبیاء اور تحقیق کلی طبعی (۵) مکاتب کے سلسلے میں دو حدیثوں میں تعارض کا حل (۶) یہ مکتوب حضرت کا نہیں ہے بلکہ مسائل محمد حسین بٹالوی (اہل حدیث) کا ہے (۷) انکار نبوت اور انکار معجزہ کا جواب (۸) ہندوستان میں سود کا حکم اور مرہونہ زمینوں کا کی آمدنی کا حکم (۹) شہادت حضرت حسین کا اثبات (۱۰) مبحث امامت کی تحقیق اور طوسی کے استدلال کا جواب اور دو حدیثوں کی شرح (۱۱) حدیث من لم یعرف امام زمانہ کی شرح یہ سارے مکاتیب فارسی زبان میں ہیں ان میں سے مکتوب اول ہشتم کا ترجمہ مولانا محمد طیب صاحب نے کیا ہے جو القاسم کی بارہویں جلد میں شائع ہوا ہے اور حال میں پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی ثم پاکستانی نے تمام مکاتیب کے ترجمہ اور تسہیل کی خدمت انجام دی ہے جو "انوار النجوم" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

الخط المقسوم من قاسم العلوم (عربی):- جز الذی لا یتجزیٰ کا اثبات اور سماع وغنا کی تحقیق مولانا محمد رحیم اللہ صاحب بجنوری شاگرد مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نام دو مکتوب جو نہایت فصیح عربی میں ہیں اس کتاب میں شامل ہیں۔

القصہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی دستیاب ساٹھ کتابوں میں زیادہ تر مکتوبات شامل ہیں اور یہی ان کے اہم ترین تصنیفی اور تالیفی کارنامے ہیں اور جن میں ان کے افکار و خیالات بکھرے پڑے ہیں۔ جس سے ان کے علمی، تحقیقی، ادبی، لسانی اور تعلیمی نکات کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور ان کے مطالعہ کے بغیر مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تعلیمی نقطۂ نظر کا صحیح تعین کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا ان کی تصنیفات اور تالیفات اور مکتوبات کا مختصراً تذکرہ اس لئے کر دیا گیا تا کہ انکے تعلیمی تصورات کے بغور مطالعہ اور افہام و تفہیم میں معاونت ہو سکے۔

باب سوم
عہد و ماحول

☆ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد

☆ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکمرانی وتجارت

☆ البیرونی کی ہندوستان آمد

☆ شاہان تغلق ولودی

☆ عہد مغلیہ میں تعلیمی ترقی

☆ تعلیمی صورت حال

☆ تعلیم انگریزی عہد حکومت میں

☆ ہندوستان میں جدید مغربی تعلیم

☆ میکالے کی تعلیمی پالیسی کے اثرات

☆ پہلی جنگ آزادی کے بعد کے تعلیمی حالات

☆ مسلمانوں میں تعلیمی تقسیم

عہد وماحول

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے جن حالات میں دیوبند تحریک کی شروعات کی اور دارالعلوم دیوبند قائم کیا ان حالات کو پورے سیاق وسباق میں سمجھنا ضروری ہے کیوں کہ کسی بھی شخصیت اوراس کے کارنامے اور افکاروتصورات کی افہام وتفہیم کے لئے اس کے عہدوماحول کا بہت بڑادخل ہوتا ہے اوراس عہدوماحول کے تناظر میں ہی کسی تاریخی شخصیت اس کے کارنامے اور افکاروتصورات کا صحیح تجزیہ ممکن ہوتا ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ایک ایسے قدیم مذہبی تعلیم میں نئی روح پھونک کراس میں حرکت وتوانائی بھرنے کی کوشش کی جب ہندوستان میں جدید مغربی علوم وسائنس متعارف ہورہے تھے۔ یورپ کی تیز رفتارترقی اورمشینی کلچر ہندوستان سمیت ساری دنیامیں مقبول ومشہور ہورہا تھا اور ہندوستان بھی جدیدترقی کی راہ پر گامزن ہونے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ ریلوے، دخانی جہاز، جدید مواصلاتی ذرائع، بینک غرض کہ ہروہ چیز جوکسی ملک کی ترقی کے لئے ضروری تھی ہندوستان میں آچکی تھی لیکن اس جدیدترقی کی آڑ میں ہماری وہ کون سی اہم اورقیمتی شے کے تباہ ہونے کا خدشہ تھا جس کے لئے اس دور میں مذہبی تعلیم وشریعت کے احیاء کوضروری سمجھا گیاان سب کی جانکاری کے لئے انیسویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی، سماجی، معاشی اورتعلیمی حالات کواس کے پورے تاریخی پس منظر میں دیکھنا ہوگا کیونکہ اس کے بغیر مولانا کے تعلیمی تصورات کا سائنٹفک جائزہ ادھورا اورنامکمل رہیگا۔

<u>ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد:</u>۔ ہندوستان میں علم وآگہی اورتعلیم وتعلم کی روایت کافی قدیم ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے قبل ہندوستان سیاسی اور مذہبی انتشار کا شکار تھا۔ ۶۴۸ء میں ہرش وردھن کی وفات کے بعد یہاں کی سیاسی

مرکزیت ختم ہو چکی تھی۔ راجپوتوں نے ملک کے مختلف علاقوں میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لی تھیں جس سے سیاسی مرکزیت کا تصور ہی مفقود ہو چکا تھا۔ قدیم ویدک دھرم جو خدائے واحد کی وحدانیت کا علمبردار تھا۔ ایک خدا میں یقین رکھتا تھا اور بت پرستی کا مخالف تھا برہمنوں کی نئی مذہبی تشریحات کے نتیجے میں تین مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور ایک خدا کی جگہ شیو، وشنو اور برہما کی پوجا ہونے لگی تھی جس سے قدیم ویدک دھرم میں تین مذہبی عقائد کے ماننے والے پیدا ہو گئے تھے اور ان تینوں عقائد رکھنے والے تین مذہبی فرقوں میں بٹ گئے تھے۔

برہمنوں نے رام اور کرشن کو اپنا مذہبی ہیرو بنا کر دیوتا کی حیثیت دیدی تھی اور جگہ جگہ اپنی دیوی دیوتاؤں کی تعریف و پرشنسا شروع کر دی تھی اور ان کے ناموں پر عبادت گاہیں تعمیر کرنی شروع کر دیں۔ ان کی دیکھی دیکھا دوسرے عقائد اور فرقوں نے بھی اپنے دیوی دیوتاؤں کے نام پر مذہبی عبادت گاہیں بنوائیں اور شیوالوں کی تعمیر کروائیں۔ برہمنوں نے بدھ مذہب کی تعلیم کے اثرات کو کم کرنے کے لئے ذات پات کے سسٹم کو بڑھاوا دیا اور انکی اشاعت کے لئے ذاتوں میں مزید ذیلی ذاتیں رائج کیں۔ بدھ مذہب میں نجات براہ راست اپنے اعمال کی بدولت ملتی تھی لیکن نئے برہمن واد میں صرف برہمن ہی نجات دہندہ بن گیا تھا جس سے ہندو مذہب پر پورے طور پر اب برہمن کی اجارہ داری قائم ہو گئی تھی۔ برہمنوں نے اپنے برہمن نظام کو مستحکم کرنے کے غرض سے اور بدھ ازم کو کمزور کرنے کی نیت سے اپنے دیوتاؤں کی فہرست میں گوتم بدھ کو بھی شامل کر لیا جس سے ہندوستانی معاشرے پر مکمل طور پر برہمنوں کا تسلط قائم ہو گیا۔

ہرش وردھن کے ہی زمانے میں مسلمانوں کے قافلے ہندوستان آنے لگے تھے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت (۶۳۸-۶۳۷ء) میں ہندوستان کے تھانہ اور بھڑوچ کے علاقوں میں مسلمانوں کے بعض حملوں کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کو نے ہندوستان میں اس قسم کی عسکری

مہمات پر حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے انہیں مزید حملے کرنے یا آگے بڑھنے پر روک لگا دی تھی لیکن جب ۶۶۳ء میں مسلمان افغانستان میں داخل ہو گئے اور وہاں کے ایرانی حکمرانوں کو شکست دیکر کابل پر قبضہ کر لیا تو وہاں سے کبھی کبھار لاہور اور ملتان تک اپنے فوجی قافلے بھی بھیجنے لگے۔ ہندوستان میں سیاسی طور پر مسلمانوں کا باقاعدہ داخلہ محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے ہوتا ہے اور محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے بہت پہلے مسلمان سیاح اور تجار ہندوستان آنے لگے تھے چنانچہ محمد بن قاسم کے فتح سندھ کے وقت بھی سندھ میں بہت سے مسلمان آباد تھے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں کابل وسندھ۔ نویں صدی عیسوی میں مالابار اور دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے مشرقی ساحلی علاقوں میں مسلمان پھیل چکے تھے لیکن مسلمانوں کی وجہ سے راجپوتوں کو اپنی حکمرانی میں کسی قسم کی پریشانی کا احساس نہیں تھا اس لئے راجپوت حکمرانوں نے انکی ہندوستان آمد اور سکونت اختیار کرنے پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا بلکہ بحیثیت تاجر وسیاح ان کی ہر طرح کی پزیرائی کی۔ البتہ جب سبکتگین اور محمود غزنوی نے ہندوستان پر پے درپے حملے شروع کر دیئے اور مسلمان پنجاب تک بڑھ گئے تو انھیں پریشانیوں کا احساس ہونے لگا۔ ۹۹۱ء میں راجہ جے پال نے ہندوستان کے سارے راجپوت راجاؤں کو جمع کر کے انھیں متحد کرنے کی کوشش کی لیکن بعض وجوہات کی بنا پر راجپوت راجاؤں کی اتحاد کی یہ کوشش ناکام ہوگئی کیوں کہ برہمنوں کی مذہبی اجارہ داری اور ان کی منصوبہ بندی نسلی امتیاز کی پالیسی نے اور رعایا کے ساتھ حکمرانوں کے غیر منصفانہ برتاؤ نے حکمرانوں کو عوامی ہمدردی سے محروم کر دیا تھا جبکہ مسلمانوں کا اسلامی تعلیمات احترام آدمیت، اخوت ومساوات اور سب کے ساتھ یکساں انصاف وعدل کے اصول سے ہندوستانی عوام متعارف ہونے لگے تھے اور عام ہندوؤں کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے تئیں ہمدردی کے جذبات پیدا ہونے لگے تھے جس سے ہندوستان میں مسلمانوں کو

اپنے قدم جمانے میں مدد ملی اور مسلمان بتدریج آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکمرانی اور تجارت:۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے سب سے پہلے سندھ میں اپنے آپ کو سیاسی اعتبار سے مضبوط بنایا۔ انکی ایماندارانہ تجارتی پالیسی اور سب کے ساتھ یکسانیت و مساوات کے طور طریقوں میں سندھی ہندوؤں کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک کے لوگوں کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا۔ کیونکہ چاڑکیہ حکومت کے خاتمے کے بعد ہندستان کے باہری دنیا کے سارے تجارتی رابطے ختم ہوگئے تھے۔ مسلمانوں نے اپنے عرب ملکوں سے نئے طریقے سے تجارتی سلسلے شروع کئے جس سے ساری دنیا سے نئے سرے سے ہندوستان سے تجارتی تعلقات بحال ہوگئے اور ہندوستان پھر تجارتی، معاشی اور اقتصادی اعتبار سے مظبوط ہونے لگا۔ عالمی تجارت کے نئے امکانات اور مسلم تاجروں کی صاف ستھری اور شفاف تجارتی پالیسی نے ساری دنیا کے تاجروں کو متاثر و متوجہ کرنا شروع کردیا جس سے ہندوستان میں چوطرفہ تجارت کو فروغ ملنے لگا اور ہندوستان عالمی سطح پر ایک بڑے تجارتی مرکز کی حیثیت اختیار کرنے لگا۔ تجارتی ترقی اور معاشی خوشحالی نے ہندوستانی عوام میں مسلمانوں کی قدر و منزلت کو اہمیت دی اور ایک خود کفیل اور خوشحال معاشرے کی تشکیل ہونے لگی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ان کے جدید طرز کے تجارتی طور طریقوں اور ایماندارانہ اور اطمینان بخش تجارتی اصولوں نے ہندوستان میں معاشی خوشحالی کو فروغ دیا۔ تجارت کے فروغ اور معاشی ترقی نے ہندوستان میں ایک نئی سیاسی وحدت کے تصور کی راہ ہموار کی اور ایک نیا ترقی یافتہ خوشحال معاشرہ تشکیل پانے لگا۔ صنعت اور تجارت کو فروغ ملا۔ مسلم تاجر عموماً اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے تھے کیونکہ اس زمانہ میں مسلمان ہونا اور ان پڑھ ہونا دو متضاد باتیں تھیں کیونکہ خدا کی پہلی وحی پڑھنے اور دوسری آیت قلم یعنی لکھنے سے متعلق تھی لہٰذا مسلمان تعلیم کو فرض اولین تصور کرتے تھے کیونکہ دنیا میں اسلام جہالت کے خاتمے کے لئے ہی آیا ہے چنانچہ مسلم تاجروں کے اصول

وضوابط، طور طریقوں اور علمی حیثیت سے ہندوستانی تجارت پیشہ لوگ کافی متاثر ہوئے جس سے ہندوستان میں عام تعلیم کی ابتدائی سوچ پیدا ہوئی۔

محمود غزنوی نے ۱۱۹۲ء میں پرتھوی راج چوہان کو شکست دیکر ہندوستان میں مسلم حکومت کے قیام کا آغاز کیا اور اجمیر وغیرہ شہروں میں اسلامی مکتبوں و مدرسوں کی بنیاد ڈالی جس سے ہندوستان میں ایک نئے طرز کی تعلیم کی بنیاد پڑی۔ اس نئے طرز تعلیم میں کسی امتیاز اور بھید بھاؤ کی گنجائش نہیں تھی جس سے ہندو اشرافیہ کے ساتھ ساتھ عام لوگ بھی حیرت زدہ ہونے لگے۔ ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک نے شہاب الدین غوری کے نمائندے کی حیثیت سے جب سلطنت کی باغ ڈور سنبھالی تو دہلی کو سیاسی اور تمدنی مرکزیت حاصل ہونے لگی۔ اس نے مسجدیں تعمیر کروائیں جن میں مکتبوں کا قیام کیا گیا اور علم و آگہی کو فروغ ملنے کے لئے نئی تعلیمی فضا ہموار ہونے لگی۔ مسلم اہل علم اور دانشوروں نے اپنی تحریروں اور کتابوں کے ذریعہ دنیا بھر میں ایک نئے متمدن ہندوستان کا تعارف کرایا جس سے ہندوستان میں علمی ترقی کو شہرت ملی اور عرب و ایران کے اہل علم و دانش ہندوستان کی طرف متوجہ ہونے لگے۔

شمس الدین التمش نے ۱۲۱۱ء میں سلطنت سنبھالی وہ کافی تعلیم یافتہ تھا اس نے دہلی کو علمی تمدنی مرکزیت عطاء کرنے میں نمایاں کارنامے انجام دیئے اس نے مدرسہ معزیہ کا قیام کیا اور ہندوستان میں سیاسی اتحاد، متحدہ حکومت اور تعلیمی و تہذیبی ترقی کا تصور پیدا کیا سلطان ناصرالدین کے وزیر اعظم غیاث الدین بلبن نے ایک نئے مدرسے کی تعمیر کروائی اور اس کا نام اپنے بادشاہ کے نام پر مدرسہ ناصریہ رکھا اس کے بعد تقریباً سبھی غلام بادشاہوں نے ہندوستان میں مدرسوں اور مکتبوں کا قیام کر کے ہندوستان میں تعلیمی ترقی کو اہمیت دی جس سے دلی تعلیمی و تہذیبی مرکز بن گئی۔ دلی کی تعلیمی، تہذیبی، ثقافتی ترقی میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔

غلام بادشاہوں کی طرح خلجی بادشاہوں نے تعلیم کی ترویج و اشاعت میں کسی خاص دلچسپی

کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ کچھ مورخین کے مطابق جلال الدین خلجی نے تعلیمی اداروں کو دیئے گئے عطیات واوقاف کو بھی ضبط کرلیا تھا لیکن حوض خاص کا تاریخی مدرسہ کی تعمیر کا شرف بھی جلال الدین خلجی ہی کو حاصل ہے مبارک شاہ نے تعلیم پر خاص توجہ دی اور تعلیمی اداروں کے عطیات و اوقاف جو ضبط کئے گئے تھے انھیں دوبارہ لوٹا دیئے اور تعلیمی ترقی میں خوب دلچسپی کا مظاہرہ کیا لیکن بدقسمتی سے وہ زیادہ دنوں تک حکمرانی نہ کرسکا اس لئے اس کی تمام تعلیمی ترقی سے دلچسپی کے باوجود تعلیم کے فروغ میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

۱۳۲۵ء میں محمد تغلق بادشاہ بنا وہ بڑا دانشور اور مدبر حکمراں تھا اس نے تعلیم کی ترویج و اشاعت پر کافی زوردیا۔ ۱۳۲۷ء میں اس نے دلی کے بجائے دولت آباد کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس کا یہ اقدام سیاسی اور انتظامی اعتبار سے چاہے جیسا بھی رہا ہو لیکن تعلیمی اور تہذیبی اعتبار سے اس نے شمال وجنوب میں نئے رشتے قائم کئے جس سے تعلیم وتہذیب کی توسیع ہوئی۔ دلی علم اور اہل علم سے خالی ہوگئی اور ساری تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز دکن بن گیا دلی کی اس تعلیمی اور تہذیبی کمی کو پورا کرنے کے لئے اس نے ۱۳۴۰ء میں ایک عظیم الشان مدرسہ کا قیام کیا۔ فیروز شاہ تغلق کے دور میں تعلیم اور خصوصاً اعلیٰ تعلیم کو خوب فروغ حاصل ہوا اور فرشتہ کے بیان کے مطابق اس نے تیس نئے مدرسوں کی تعمیر کروائی۔ حوض خاص کے پاس جو مدرسۂ فیروز شاہی قائم تھا وہ دراصل اپنے دور کا عظیم الشان اقامتی جامعہ (یونیورسٹی) کا درجہ رکھتا تھا۔ جس میں اپنے عہد کے عظیم عالمی دانشور مولانا جلال الدین رومی شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے دور حکومت میں تعلیم وتعلم کی ایسی گرم بازاری ہوئی کہ صرف دلی میں مدرسوں کی تعداد تین ہزار تک پہونچ گئی تھی۔ اسی علم دوست بادشاہ نے ہندوستان میں پہلے پہل باقاعدہ معاشی تعلیم کا بندوبست کیا تھا۔ اس کے دور حکومت میں چھتیس لاکھ (۳۶۰۰۰۰۰) روپے سرکاری خزانہ سے سالانہ تعلیم پر خرچ کئے جاتے تھے۔ جو ہندوستان میں ابتک کی تعلیم پر خرچ کی جانے والی سب سے بڑی

سرکاری رقم تھی اس سے پہلے کسی ہندوستانی راجہ یا بادشاہ نے اتنی بڑی رقم تعلیم کے مد میں نہیں خرچ کی تھی اس کے دور میں بنیادی اور اعلیٰ تعلیم کی تیز رفتار ترقی ہوئی اور ہندوستان میں پڑھنے پڑھانے اور درس و تدریس کو خوب رواج حاصل ہوا۔ اس نے اپنے دربار میں اٹھارہ سو (۱۸۰۰) نوجوانوں کو قرآن شریف کی کتابت کرنے کے لئے ملازم رکھے اور بہت سی سنسکرت کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا اور ہندوستان ماہرین اساتذہ اہل علم و دانش کا گہوارہ بن گیا۔ فیروز شاہ نے ہی علاؤالدین خلجی کے بنائے ہوئے تالاب پر ایک خوبصورت عمارت تعمیر کروائی تھی جس کے بارے میں ضیاء الدین برنی اور صاحب نزہتہ الخواطر نے لکھا ہے کہ ''اس کی عمارت لمبے لمبے اور اونچے اونچے ستونوں پر قائم تھی اور ایک وسیع میدان میں تھی۔ عمارت پر بکثرت قبے بنے ہوئے تھے اور بکثرت درمیان درمیان میں صحن تھے ایسی عمارت مدرسے کی نہ اس سے پہلے کہیں بنی تھی نہ بعد میں......... اپنی جسامت نیز وسیع گذرگاہوں، پاکیزہ آب وہوا کے لحاظ سے اس کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہونا چاہئے۔ جو اس میں داخل ہوجاتا ہے پھر نکلنا نہیں چاہتا ہے۔''

سیدوں اور لودھیوں کے دور حکومت (۱۴۱۴ء-۱۵۲۶ء) میں سکندر لودھی کے علاوہ کسی اور بادشاہ یا سلطان نے تعلیم پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ سکندر لودھی خود بھی عالم و دانشور اور شاعر تھا اور اس نے تعلیم کے فروغ میں نمایاں کارنامے بھی انجام دیئے۔ اس نے بہت سے مدارس قائم کئے اور دنیا جہاں سے لائق فائق اساتذہ کو ہندوستان بلاکر ہندوستان کو عظیم الشان تعلیمی مرکز کی حیثیت دیدی اس کی علم منادی کا چرچا سن سن کر بڑے بڑے علماء کے قافلے ہندوستان میں وارد ہونے لگے۔ اس نے متھرا اور نرور وغیرہ میں اپنے قائم کئے ہوئے مدارس میں بلا امتیاز مذہب و برادری سبھی کے لئے تعلیم کے لئے دروازے کھول دیئے جس سے ہندوؤں میں بھی عربی فارسی کی تعلیم عام ہونے لگی اور انہیں سرکاری ملازمتیں ملنے لگیں تو عام ہندوؤں میں

تعلیم کا رواج بھی عام ہونے لگا اور انکی حوصلہ افزائی ہونے لگی۔

سکندر لودھی تقریباً تیس سالوں تک ہندوستان کا بادشاہ رہا اور اپنے دور حکومت میں اس نے جو علم وفن کی قدر دانی کا مظاہرہ کیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لائے ہوئے علوم اور ان کے فیوض وبرکات کا دریا بہنے لگا۔ دلی اور قرب وجوار کے علاقے علم وفن کی چہل پہل کا ایسا نظارہ پیش کرر ہے تھے کہ لگتا تھا کہ ہندوستان بغداد وشیراز اور نیشاپور بن گیا ہے۔ مورخوں اور تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق سکندر لودھی کے عہد ِ حکومت میں عرب اور عجم اور دنیا جہان کے صاحب علم وفن اور اہل دانش وماہرین ہندوستان میں جمع ہو گئے تھے۔ دو ملتانی بھائی شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ اپنے دور کے مایہ ناز اساتذۂ فن اور فن تدریس میں ایسا کمال رکھتے تھے کہ اس کی مثال دینی مشکل تھی۔ ایک دلی میں اور دوسرے نے سنبھل میں اپنی مسند تدریس قائم کی اور تعلیم وتدریس کی ایسی گرم بازاری شروع ہوئی کہ ہندوستان میں چراغ سے چراغ جلانے کی عظیم الشان تعلیمی روایت قائم ہوگئی جس کا سلسلہ آج بھی کسی نہ کسی صورت میں برقرار ہے۔ سکندر لودھی کے ہی زمانہ میں ... انھیں ملتانی بھائیوں اور دوسرے ماہرین علوم کے سبب ہندوستان میں تعلیمی نصاب پر خصوصی توجہ دی گئی اور وقت وحالات کے مطابق باقاعدہ نصاب ترتیب دیکر اس میں معقولات کو بھی شامل نصاب کیا گیا۔ اس طرح عہد سکندر لودھی میں ہمہ جہت تعلیمی ترقی ہوئی اور ہندوستان اپنے عہد کا عظیم الشان تعلیمی اور تہذیبی مرکز بن گیا۔

<u>البیرونی کی ہندوستان میں آمد</u>:۔ معروف مسلم سیاح، مفکر اور جغرافیہ داں علامہ ابو ریحان البیرونی سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں ہندوستان آیا اس نے یہاں کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور یہاں کی علمی وتہذیبی سرگرمیوں سے متعارف ہوا اور اپنی مشہور زمانہ کتاب ”کتاب الہند“ تصنیف کی۔ اس نے اپنی اس کتاب میں ہندو فلسفہ وروایات اور عقائد وتمدن پر اس طرح سیر حاصل بحث کی کہ دنیا کی نگاہیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے مختلف اہم

سنسکرت کتابوں کا عربی میں اور عربی کتابوں کا سنسکرت زبان میں ترجمہ کر کے ہندوستان وعرب کے علمی، ادبی، تاریخی، جغرافیائی اور تہذیبی کارناموں سے دنیا کو متعارف کرایا اور علمی وتہذیبی روایتوں کو ایک دوسرے تک پہونچانے کا عظیم الشان کارنامہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے لئے مفید وکار آمد بنا دیا جس سے دنیا کے چار بڑے تہذیبی اور جغرافیائی حصے تعلیمی، ثقافتی، ادبی اور جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب ہو گئے۔ ہندوستان کے عرب وعجم سے نئے علمی اور تہذیبی رشتے قائم ہوئے اور پھر عربوں کے توسط سے مغربی دنیا ہندوستان سے ایک نئے انداز مین متعارف ہوئی اور دنیا کے ایک بڑے آباد علاقے میں رواداری، وضع داری اور میل ملاپ کی نئی روایت قائم ہوئی اور ہندوستان میں ایک ایسا مشترکہ معاشرہ تشکیل پانے لگا جس میں مسلم حکمرانوں نے مستحکم حکومتی نظام، مال گذاری، دفاتری اصول وضوابط، آداب حکمرانی، عدالتی نظام، کھیل کود، علمی ادبی سرگرمیاں، سڑکوں، کنوں، سرایوں کی تعمیر، تجارتی منڈیاں، کشمیر، مدراس، گجرات، بنگال اور ظفرآباد (جونپور) وغیرہ میں کاغذ کے کارخانے قائم کر کے تعلیم وتعلم اور درس وتدریس کو فروغ دیکر ہندوستان کو علمی اور تہذیبی طور پر مالا مال کر دیا جس سے ہندوستان میں ہمہ جہت تعلیمی وتعمیری سوچ کی ذہن سازی ہوئی اور ہندوستان بڑے پیمانے پر قابل توجہ ملک بن گیا۔

ہندوستان کا مشہور پودہ "چائے" جو آج ساری دنیا کے لئے اہم ضرورت بن گیا ہے اور جسے دریافت کرنے اور شہرت دینے کا سہرا ہمیشہ عموماً انگریزوں کے سر باندھ دیا جاتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں کے ہندوستان آنے سے کئی صدی قبل باہری دنیا کو اس پودے کی البیرونی اور اس کی کتاب "کتاب الہند" نے جانکاری دی تھی۔ اس نے اپنی کتاب میں "چائے" کے نام سے چائے کا تذکرہ کیا تھا۔ اگر چہ البیرونی بھی چائے کی دریافت کرنے والا اور دنیا کو اس کی جانکاری دینے والا پہلا شخص نہیں تھا بلکہ اس سے قبل ایک عرب مسلم تاجر جو سلیمان التاجر

کے نام سے مشہور تھا اس کے سفر نامہ ۲۳۵ھ/۸۵۰ء کے سفر کے حالات میں "اخبار الصین والہند" میں سب سے پہلے چائے (Tea) کا تذکرہ "ساخ" بمعنی چائے کے نام سے ملتا ہے اور غالباً ابتک کی تحقیق و دریافت کے مطابق یہی سب سے پہلی تحریر ہے جس میں پہلی بار چائے کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ اس لئے دنیا میں ہندوستانی چائے کی دریافت کا سہرا سلیمان التاجر کو اور باہری دنیا کو اس سے متعارف کرانے کا اولین شرف البیرونی اور اس کی کتاب کو حاصل ہے۔ انگریزوں نے صرف چائے کی تجارت کو فروغ دیکر اس سے ہونے والی آمدنی کو ہندوستان سے انگلستان لے جانے کا کام کیا ہے۔

البیرونی کی ہندوستان سیاحت علمی وتہذیبی اعتبار سے کافی فائدہ مند ثابت ہوئی۔ ہندوستان وعرب اور ایران کے علمی، ادبی، تہذیبی اور تجارتی تعلقات میں استحکام پیدا ہوئے اور علم وآگہی کے تبادلے سے ایک دوسرے سے قربت پیدا ہوئی اور قدیم دنیا کے سب سے بڑے علاقے عرب، ایران، ہندوستان اور چین وغیرہ میں نئی آمدورفت شروع ہوئی اور ہندوستان میں ایک ہمہ گیر اور وسیع فکر وخیال کو رواج حاصل ہونے لگا۔

شاہان تغلق ولودی:- محمد شاہ تغلق، فیروز شاہ تغلق اور سکندر لودی کے زمانے میں ہندوستان کو تعلیمی وتہذیبی اعتبار سے کافی ترقی نصیب ہوئی خصوصاً فیروز شاہ تغلق اور سکندر لودی نے ہندوستان کو تعلیمی مرکز بنادیا اور اہل علم ودانش کی ایسی قدر دانی کی کہ دنیا جہاں سے اہل علم ودانش کھینچ کھینچا کر ہندوستان چلے آئے اور ہندوستان ہر طرح کے علوم وفنون کا مرکز تصور کیا جانے لگا۔

ہندوستان میں مذکورہ مسلم حکمرانوں نے اپنے اپنے دور میں نئے طور طریقے سے تعلیمی نظام قائم کیے اور مقاصد تعلیم، طریقہائے تعلیم اور نصاب تعلیم پر توجہ دی اور تعلیم کے دروازے آزادانہ طور پر سب کیلئے کھول دیئے جس سے ہندوستان میں علم وآگہی کی دولت کو عمومیت حاصل

ہونے لگی اور یہاں کے لوگوں نے پہلی بار محسوس کیا کہ تعلیم ہر کوئی حاصل کرسکتا ہے۔ کیونکہ اس سے قبل تعلیمی نظام پر برہمنوں کی بالادستی تھی اور صرف اونچی ذات کے لوگوں کو ہی تعلیم حاصل کرنے کا حق تصور کیا جاتا تھا۔ پسماندہ ذات کے لوگوں اور عام ہندوستانیوں میں نہ تو تعلیم کا تصور ہی تھا اور نہ ہی سماجی اعتبار سے انھیں اس کی اجازت ہی حاصل تھی۔ مسلم حکمرانوں نے تمام بنی نوع انسان کو ایک خدائے واحد کے بندے اور حضرت آدم کی اولاد کا اسلامی نظریہ پیش کیا اور یہ بھی عملاً کر دکھایا کہ کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے سوائے تعلیم اور نیکی کے۔ انھوں نے جس یکسانیت اور مساوات کے اصولوں کے تحت تعلیمی نظام قائم کیے وہ ہندوستانیوں کے لیے بالکل نئے اور حیرت انگیز تھے جس سے مسلم حکمرانوں کو ہندو عوام کی مقبولیت اور ہمدردی حاصل ہوگئی۔ مسلم حکمرانوں، وزیروں اور امراء نے جو تعلیمی ادارے قائم کیے اس میں بلا امتیاز مذہب و ملت اور ذات و برادری مسلمانوں کے ساتھ ساتھ تمام ہندو طبقات کو بھی ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دیدی جس سے ہندوستان میں متحدہ معاشرہ، متحدہ تہذیب و ثقافت کو فروغ عام ملنے لگا اور تعلیم عام اس نظام کی شہرت و مقبولیت نے متحدہ قومیت کے ابتدائی تصورات پیدا کیے ہندوؤں نے مسلمانوں کی تعلیمی پالیسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپسی اتحاد اور میل ملاپ کو بڑھاوا دیا اور اہم ترین سرکاری منصوبوں پر فائز ہونے لگے۔

ہندوستان میں مسلمان اگر چہ فاتح کی حیثیت سے آئے تھے مگر جلد ہی یہاں کے شہری بن کر یہیں کے ہو کر رہ گئے اور ہندوستان کو اپنا ملک و وطن بنا کر اس کی ہمہ جہت ترقی اور اسے سجانے سنوارنے میں اس طرح لگ گئے کہ اپنا اصلی ملک و وطن ہی بھول گئے چنانچہ اس کا اعتراف آزاد ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد اور آزاد ہندستان کے عظیم ماہر تعلیم ڈاکٹر رادھا کرشنن اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم اور جدید ترقی کے معمار اول پنڈت جواہر لعل نہرو نے بھی اپنی کتابوں میں کیا ہے۔

ہندوستان میں مسلم حکمرانوں نے جس تعلیم عامہ کو رواج دیا اس نے ہندوستانی تہذیب وثقافت اور رواداری ووضع داری میں چار چاند لگادیے۔ مسلم تاریخ دانوں اور جغرافیہ دانوں نے ہندوستان میں اپنے لائے ہوئے ان دونوں علوم کو ہندوستان میں موجود تاریخی آثار اور جغرافیائی حالات سے ہم آہنگ کر کے تاریخ وجغرافیہ جیسے علوم کی اہمیت سے روشناش کرایا اور ان کی تدریس وتعلیم کا انتظام کر کے اپنے دور کے ان دونوں جدید علوم کی ترقی سے ہندوستان کو بام عروج پر پہونچادیا۔

<u>عہد مغلیہ میں تعلیمی ترقی</u>:۔ مغلوں کی آمد سے قبل سلطنت عہد میں جو تعلیمی ترقی رونما ہوئی اور ہندوستان اور ہندوستان کے باہر ہندوستانی مسلم حکمرانوں کی علم دوستی اور اہل علم کی قدردانی کی جو شہرت پھیلی تھی اس نے عہد مغلیہ میں تعلیمی ترقی کے نئے نئے راستے کھول دیے اور ہندوستان میں موجود بے شمار اہل علم ودانش اور ماہرین واساتذہ نے مل کر یہاں تعلیم وتعلم کا ایسا بازار گرم کردیا کہ ہر گلی کوچہ میں علم کا چرچا ہونے لگا۔

۱۵۲۶ء میں ہندوستان میں مغلوں کو فتح حاصل ہوئی۔ پہلا مغل بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ، دانشور اور مدبر حکمراں تھا۔ وہ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کا ماہر تھا اور ان زبانوں میں شاعری اور نثر نویسی بھی کرتا تھا۔ اس نے خود کئی کتابیں لکھیں اور اپنے پیش رو مسلم حکمرانوں کی تعلیمی ترقی کو مزید وسعت بخشی اور ایک نئے منصوبہ بند تعلیمی نظام کے فروغ کی کوششیں کیں اس نے ''شہرت عامہ'' نامی نئے محکمہ کا قیام کیا اور اپنی سلطنت میں مکتبوں اور مدرسوں کی تعمیر اور دیکھ ریکھ کی ذمہ داری سونپ دی۔

''تزک بابری'' جو بابر کی ہی تصنیف کردہ کتاب ہے وہ بابر کی ہمہ جہت خصوصیات وشخصیت کا ایک جامع مرقع ہے۔ اس کتاب میں ترکستان اور افغانستان وغیرہ کے مناظر کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے مشاہدات وتجربات کے بیانات ملتے ہیں۔ اس نے ''خط بابری'' نامی

ایک مخصوص خط کی ایجاد کی اور اپنے ایجاد کردہ اسی مخصوص خط میں قرآن مجید کے کئی نسخے تحریر کیے اور انھیں بطور ہدیہ مکہ معظمہ بھجوائے۔ وہ ہندوستان میں زیادہ عرصہ تک حکمرانی نہ کرسکا اس لئے اس کے مدارس کی تعمیر کا عظیم الشان منصوبہ اور ہندوستان میں تعلیمی ترقی کے تمام خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے۔ پھر بھی اس نے جو کچھ کیا وہ آج بھی تاریخ کے صفحوں میں روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔اس نے اپنے لڑکے ہمایوں کو جو وصیت نامہ لکھا تھا اس سے اس کے سیاسی تہذیبی اور فکری تصورات کا پتہ چلتا ہے اور جس نے ہندوستان میں ایک سیکولر غیر متعصب اور رواداروضع دار مغلیہ سلطنت کے لئے راہ ہموار کی۔

بابر کی وفات کے بعد اس کا لڑکا ہمایوں ۱۵۳۰ء میں حکمراں ہوا لیکن جلد ہی شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر پنجاب وسندھ کے میدان وجنگلات کی خاک چھانتے ہوئے ایران پہونچ گیا۔ شیر شاہ سوری بھی ایک کامیاب حکمراں تھا اس نے تقریباً پانچ سال کی قلیل مدت تک ہی ہندوستان میں حکمرانی کی۔وہ جونپور کے مدرسوں کا تعلیم یافتہ تھا جسے اس زمانہ میں شیراز ہند کا درجہ حاصل تھا۔ شیر شاہ کی ذہانت وقابلیت کا یہ عالم تھا کہ ''گلستاں وبوستاں'' اور ''سکندر نامہ'' جیسی ضخیم کتابیں اسے زبانی یاد تھیں۔اسے فلسفہ اور تاریخ سے بھی خاص لگاؤ تھا وہ بڑا علم دوست اور بیدار مغز وحکمراں تھا اس نے اپنے مختصر ترین دور حکمرانی میں عوامی فلاح وبہبود کے ایسے ایسے محیر العقول کارنامے انجام دیے کہ آج بھی حیرت وتعجب ہوتا ہے۔اس نے نارنول میں ایک بڑے اور نئے طرز کے مدرسہ کی تعمیر کروائی مگر زندگی نے اسے موقع نہیں دیا تو گرانٹ ٹرنک روڈ (جی.ٹی.روڈ) جو کلکتہ سے پشاور تک کی عظیم سڑک بنوائی تھی اسی طرح تعلیمی میدان میں بھی اس سے ایسے ہی حیرت انگیز کارنامے کی توقع کیجا سکتی تھی۔

۱۵۴۰ء میں ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر جب راجپوتانہ اور سندھ کے جنگلات وریگستان میں مارا مارا پھر رہا تھا اس کے بھائیوں نے اس کی کوئی مدد نہیں کی تھی چنانچہ وہ کسی طرح

ایران پہونچنے میں کامیاب ہوگیا۔ ایران کے بادشاہ طہماسپ صفوی نے ہمایوں کے ساتھ حسن سلوک کیا اور ایک عرصہ تک مہمان رکھنے کے بعد ہمایوں کے دوبارہ ہندوستان جانے کی خواہش پر ایک بڑی فوجی مدد کے ساتھ اسے ہندوستان کے لئے روانہ کیا اور ہمایوں نے ۱۵۴۵ء میں قندھار کابل اور ۱۵۵۵ء میں دہلی و آگرہ میں دوبارہ قبضہ کرلیا لیکن ابھی وہ سیاسی اعتبار سے مستحکم بھی نہیں ہو پایا تھا کہ دلی میں اپنے تعمیر کردہ عظیم الشان کتب خانہ کے چھجے سے گر کر فوت ہوگیا۔ مشہور مورخ جعفر کے قول کے مطابق اس کے مقبرے سے متصل ایک عظیم الشان مدرسہ واقع تھا جس سے متاثر ہو کر شیر شاہ سوری نے نارنول میں اپنا مشہور زمانہ مدرسہ قائم کروایا تھا۔

ہمایوں جب ایران سے ہندوستان آیا تو اس کے ساتھ کثیر ایرانی سپاہی، امراء اور اہل علم و دانش بھی ہندوستان آئے جس سے ہندوستان میں نئے سرے سے ایرانی علم وحکمت کو فروغ حاصل ہوا اور جو یہاں ہندایرانی تہذیب وتعلیم کے اثرات نمایاں ہوئے وہ عرب وتوران کے مقابلے میں کہیں زیادہ گہرے اور دیرپا ثابت ہوئے۔ اس سے قبل عہد غزنوی وسکندر میں بھی ایرانی علماء اور اہل علم ہندوستان آچکے تھے اور بڑی تعداد میں آچکے تھے جس سے ان کی تعداد میں حیرت انگیز طور پر اضافے ہوگئے اور ہندوستان اور ایران کے تہذیبی رشتے میں مزید گہرائی و گیرائی اور استحکام پیدا ہوگئے اور ہندوستان کی درباری اور علمی زبان فارسی جو غزنوی دور میں اپنی یہ حیثیت حاصل کرچکی تھی ہندوستان کی عام سرکاری، عدالتی اور تعلیمی زبان کا درجہ اختیار کر کے یہاں کی عوامی زبان بن گئی اور اہل ایران وتوران اور ہندوستان سبھی مل کر ہندوستان میں علوم و فنون اور تہذیب وتمدن کی اشاعت اور ترقی میں سرگرم عمل ہوگئے۔

ہمایوں کی موت کے بعد اس کا جانشیں جلال الدین محمد اکبر بنا۔ وہ کمسن لڑکا تھا اس لئے حکومتی امور بیرم خاں کے ہاتھوں میں آگیا اور ہندوستان میں ایک نئی اور تیز رفتار ترقی کی شروعات کے لئے راہ ہموار ہونے لگی۔ اکبر کے عہد حکومت میں تعلیمی ترقی کا دور شروع ہوا جو اب تک کے لحاظ

سے بالکل مختلف اور جداگانہ تھا۔ تعلیمی ترقی کو ایک نئی ڈگر ملی۔ آگرہ، فتح پور سیکری، گجرات اور دوسرے مقامات پر بڑے بڑے مدارس قائم ہوئے جو سب کے سب اقامتی تھے اور جن میں ہاسٹل اور بورڈنگ وغیرہ کی سہولیات تھیں اور طلباء و اساتذہ کے سارے اخراجات سرکاری خزانے سے پر کیے جاتے تھے۔ اکبر کے دور میں تعلیم کو حکومت کی ذمہ داری قرار دی گئی اور اس کی ترقی و فروغ میں بے پناہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا گیا اور پورے تعلیمی نظام کو جدیدی اور اثری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی گئی اور ایک نیا نصاب تعلیم ترتیب دیا گیا جس میں عصری علوم جیسے منطق، جیومیٹری، اکاؤنٹس، اسٹرونامی اور عوامی انتظامیہ جیسے مضامین کی شمولیت کر کے طریقۂ تعلیم اور مقاصد تعلیم پر خصوصی دھیان دیا گیا اور نظری تعلیم میں عملی تعلیم کو بھی شامل کر کے پورے نظام تعلیم میں ترقی اور توانائی پیدا کی گئی۔

اکبر اگر چہ خود پڑھا لکھا نہیں تھا مگر اس کی بے پناہ ذہانت و معاملہ فہمی اور علم دوستی نے تعلیم کے جدید فروغ میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ اس نے اعلیٰ تعلیم کو متنوع اور عصری ضرورتوں کے مطابق بنانے اور اس میں ہمہ گیری لانے کے لئے اس میں علم الاخلاقیات انگریزی میں (Ethics) علم الحساب (Airthmatics) کھاتہ داری (Accountancy)۔ زراعتی ناپ تول، منطق، اکنامکس، فزکس، تاریخ اور نیچرل مضامین کی تعلیم کا بندوبست کیا اور اس کے لئے ماہر اساتذہ رکھے گئے اور مسلم پریوار کے لئے قرآن خوانی اور ہندو طلباء کے لئے بیاکرن (قواعد) اور ویدانت کی تعلیم کا علحدہ علحدہ بندوبست کیا گیا۔ اس دور میں تعلیم کو کافی فروغ حاصل ہوا اور سرکاری مدارس کے ساتھ ساتھ غیر سرکاری اور پرائیویٹ مدارس و مکاتب کے قیام کو بھی رواج ملنے لگا۔ اس دور میں موسیقی، نقاشی، فلسفہ اور ریاضی میں پوسٹ گریجویٹ یعنی ماہرانہ سطح کی بھی تعلیم دی جانے لگی اور ہندوستان میں ہمہ جہت اور ہمہ گیر تعلیمی ترقی بام عروج پر پہونچنے لگی۔

اکبر بادشاہ اپنے حکمرانی کے آخری ایام میں مختلف فکری تبدیلیوں کا شکار ہوگیا اس کے مذہبی عقائد میں بھی تغیر رونما ہوگیا۔ اس نے ہندو مسلم طلباء کی مشترکہ تعلیم کا انتظام کیا نئے نئے آلات کی ایجادات کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ صنعتی تعلیم پر بھی توجہ دی اور اس کے لئے بڑے بڑے کارخانے تعمیر کروائے جہاں طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعتی تربیت (Industrial Training) کا انتظام کیا گیا۔ اس کے دربار میں موجود مشہور زمانہ ماہر تعلیم ومعاشیات اور سائنس داں میر فتح اللہ شیرازی نے عہد اکبر میں ہر طرح کی تعلیمی تبدیلی اور جدید وعصری تعلیمی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیئے۔ وہ اکبر کے وزیر اعظم کا شریک کار اور موازنہ (بجٹ) سازی جیسی مصروف ترین خدمات سے وابستگی کے باوجود شوقیہ طور پر بچوں کو پڑھانے سے کبھی باز نہیں آیا اور یہ تعلیم سے اس کے بے پناہ تعلق کی علامت کا ثبوت ہے۔

اکبر اعظم کے قائم کردہ تعلیم پر اس کے جانشین جہانگیر نے کوئی نئی تعمیر نہیں کی اس نے اپنے دور حکمرانی میں سابقہ تعلیمی سلسلے باقی رکھنے کو ہی کافی سمجھا لیکن اس میں ایک اہم دستوری اقدام یہ کیا کہ اگر کسی دولت مند یا مسافر کی موت واقع ہوجائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو ایسی صورت میں اس کی ساری منقولہ اور غیر منقولہ جائداد و ترکہ جات پر حکومت کا قبضہ ہوجاتا تھا اور اس جائداد و ترکہ جات کو مدرسوں کی تعمیر و قیام اور انتظامات میں استعمال کیئے جاتے تھے چنانچہ اس نے ایسے تیس مدارس کی مرمت کروائی جو عرصہ سے بند پڑے تھے ان مرمت شدہ مدرسوں میں طلبہ اور اساتذہ کا انتظام کیا گیا جس سے اکبر جیسی تعلیمی ترقی تو نہ ہوسکی مگر تعلیمی سلسلے بدستور قائم رہے۔

شاہ جہاں ایک ایسا جلیل القدر مغل بادشاہ تھا جس نے اپنی تمام تر دلچسپی کا مظاہرہ اچھی اور خوبصورت عمارتوں کی تعمیر میں کیا تھا لیکن اس نے تعلیم کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا تھا اس نے اپنے عہد حکومت میں اہل علم ودانشور اور علماء وشعراء کو بڑے بڑے انعامات سے نوازا جس سے

اعلیٰ تعلیم کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ ۱۶۵۰ء میں اس نے دہلی کی جامعہ مسجد سے متصل ایک مدرسہ کا قیام کروایا اور دارالبقاء نامی جو قدیم مدرسہ کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا اس کی مرمت کروائی اس کی لڑکی جہاں آرا نے تعلیم میں خاص دلچسپی دکھائی اور آگرہ کی جامعہ مسجد سے متصل عظیم الشان مدرسہ کا قیام کروایا اس نے مغل سلطنت کے دور دراز علاقوں میں بھی مدارس و مکاتب اور مساجد تعمیر کروائیں جس سے عہد شاہ جہانی میں تعلیم اور تعلیم کے دیگر وسائل کو کافی ترقی ملی متوناتھ بھنجن کی مشہور شاہی مسجد کٹرہ اور اس میں طلبہ کی تعلیم اور رہائش کے لئے حجروں کی تعمیر اور کپڑے کی بنائی کے لئے کارخانہ کے قیام کو اسی عالمہ فاضلہ شہزادی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر خود اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ وہ مدبر اور مفکر بھی تھا اور تعلیم کے بارے میں اپنا تخلیق کردہ مخصوص نظریہ بھی رکھتا تھا اور اسے ہی ہندوستان میں فروغ دینا چاہتا تھا وہ اپنے دور اور اس سے قبل کے تعلیمی نظام اور اس کے طور طریقوں سے مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ تخت نشیں ہونے کے بعد جو اس نے اپنے استاد سے تعلیمی معاملات پر بحث کی تھی اس سے اس کے تعلیمی نظریات و افکار کی ترجمانی ہوتی ہے۔ وہ ہندوستان میں عصری تقاضوں اور مستقبل کے پیش نظر اپنے تعلیمی نظریئے کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا مگر سیاسی اور جنگی حالات نے اسے اپنے تعلیمی منصوبوں پر عمل درآمد کرنے کے مواقع نہیں دیئے۔ پھر بھی اس نے حدود حکمرانی میں تمام تعلیمی سہولیات مہیا کرائیں۔ نئے مکاتب و مدارس قائم کئے۔ پہلے سے چل رہے سرکاری اور غیر سرکاری مدارس کی سرپرستی کی۔ غریب اور ذہین طلباء کی حوصلہ افزائی کے لئے وظائف کی شروعات کی۔ مکاتب و مدارس اور مسجدوں و مندروں پر جائدادیں اور جاگیریں وقف کیں۔ گجرات کے بوہرہ پسماندہ برادری کو تعلیمی اعتبار سے ایسا خود کفیل بنایا کہ وہ آج تک مسلمانوں میں سب سے زیادہ خوشحال بنے ہوئے ہیں۔ اس نے ایسا نظام تعلیم رائج کیا جس میں امیر و غریب سبھی تعلیمی دولت سے مالا مال ہو سکیں۔ اس نے تعلیم کے بنیادی حق کا تصور پیش کیا اور تعلیم

کوعوامی بنانے پر خاص توجہ دی جس سے تعلیم محض امراء و وزراء اور خوشحال لوگوں کی چیز نہ ہوکر تمام بنی نوع انسان کے حصول کی چیز بن گئی۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد پوری مغلیہ سلطنت آپسی خانہ جنگی اور اقتدار کے رسہ کشی کا شکار ہوگئی۔ تخت و تاج کے بھوکے اور زوال پزیر ذہنی دیوالیہ پن سے ہمکنار حکمرانوں سے کسی تعلیمی، تہذیبی اور تعمیری کام کی امید کرنا ہی فضول ہے۔ کیونکہ سیاسی زوال نے ہر طرح کی پستی اور سطحیت کو راہ دیدی تھی اور تعلیمی نظام کو ہی تہ و بالا کر دیا تھا اس سے باہری حملوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی پھر بھی صدیوں سے چلے آرہے تعلیمی نظام اور تسلسل سے وابستہ علماء اور اہل علم و دانش نے اپنے اپنے طور پر اپنے تعلیمی تسلسل کو بدستور قائم رکھا جس سے کوئی بہت بڑا تعلیمی بحران تو رونما نہ ہوسکا مگر تعلیمی ترقی کی تیز رفتاری اپنی جگہ پر ٹھہر ضرور گئی۔

۱۷۳۰ء کے نادر شاہی حملے نے ہندوستانی تعلیم کو زبردست نقصان پہونچایا۔ نادر شاہ ہندوستان سے جاتے وقت جہاں ہندوستانی دولت اور خزانہ کو اپنے ساتھ لے گیا وہیں اس نے ہمایوں کے قائم کردہ دہلی کے عظیم الشان کتب خانہ کو بھی اپنے ساتھ لے گیا جس سے ہندوستان میں قدیم علمی سرمایوں کا فقدان ہوگیا۔ مدارس بند ہوگئے اور ایک دوسرے کو قتل کر کے بادشاہت پانے والے ناکارہ مغل حکمرانوں اور باہری حملوں نے مل کر ہندوستان میں سیاسی، معاشی، تہذیبی اور تعلیمی زوال کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم کر دیا تھا اور صدیوں کی کوششوں کے نتیجہ میں قائم ہونے والا تعلیمی نظام بھی کمزور پڑتے پڑتے تباہی کے دہانے تک پہونچ گیا۔

تعلیمی صورت حال:- عہد مغلیہ میں بابر سے اکبر تک اور اکبر سے عہد عالمگیر تک تعلیمی صورت حال مجموعی طور پر اطمینان بخش رہی۔ تعلیم و تعلم کو خوب ترقی ملی۔ پڑھنے پڑھانے کے سلسلے کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے مواقع ملے۔ نظام تعلیم، مقاصد تعلیم، طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم مختلف نشیب و فراز اور تجربات و مشاہدات سے ہمکنار ہوئے ان میں مثبت اور کارآمد

تبدیلی لاکر اس کو فعال اور کارآمد بنانے کی کوششیں بھی ہوتی رہیں اور اس کے نتائج کا بھی بغور جائزہ لیا جاتا رہا اور ان جائزوں کی روشنی میں مستقبل کے تعلیمی لائحہ عمل بھی تیار کیے جاتے رہے۔ غرض کہ پورے عہد مغلیہ میں تعلیمی ترقی ایک توازن کے ساتھ آگے بڑھتی رہی اور جب تک سلطنت مغلیہ سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے مستحکم اور مضبوط رہی اس کے تعلیمی تسلسل میں کوئی خاص نہ رکاوٹ پیدا ہوئی اور نہ ہی پڑھنے پڑھانے کے عمل میں کوئی خلل واقع ہوا۔

بابر اپنی تمام تر قابلیت اور صلاحیت کے باوجود ہندوستانی نظام تعلیم میں کوئی انقلاب پیدا نہ کرسکا کیونکہ زندگی نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ ہمایوں عقلی علوم کا حد سے زیادہ ولدادہ تھا بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی ''با علوم ریاضی واقسام فلسفہ از ہیئت وہندسہ ونجوم میل تمام داشت'' (تاریخ حق صفحہ۹۲)۔ اس کی علمی دلچسپیاں جگ ظاہر ہیں اس کا کتب خانہ اپنے دور کا عظیم الشان اور بے مثال کتب خانہ تھا اور اس کی موت بھی اسی کتب خانہ سے گر کر ہوئی تھی۔ بعض تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ ہمایوں اپنے کتب خانہ کی سیڑھیوں پر اس وقت گر پڑا تھا جب وہ کسی ہیئتی تجربہ میں مصروف تھا۔ ہمایوں کی عقلی علوم سے بے پناہ دلچسپیوں کے باوجود کسی بڑے تعلیمی کارنامے کے آثار نہیں پائے جاتے ہیں۔ ہمایوں کے بعد اکبر مغلیہ سلطنت کا بادشاہ بنا۔ اس نے اپنے دور میں سائنسی تعلیم پر خاص توجہ دی اور تمام نئی دریافتوں اور ایجادات کی تعلیم کو کارآمد بنایا اس نے اپنے دور میں مختلف تجربات وتغیرات سے تعلیم کی ہمہ جہت ترقی کی کوششیں کیں۔ اس نے اشتراکی تعلیم کو رائج کیا اور تصنیف وتالیف میں اجتماعی اور اشتراکی اصولوں کو اپنایا۔ اس کے دور حکومت میں تعلیم کافی متنوع، ہمہ گیر اور کارآمد ہوگئی تھی۔

جہانگیر اور شاہ جہاں نے تعلیم کے جمالیاتی پہلوؤں پر خاص توجہ دی۔ انھوں نے فن تعمیر، مصوری، نقاشی، موسیقی اور دوسرے علوم وفنون جو فنون لطیفہ سے تعلق رکھتے تھے ان کی کافی حوصلہ افزائی کی لیکن ان کے جانشین نے اپنے اپنے پیش روؤں کی ڈگر سے ذرا ہٹ کر اپنی تعلیمی فکر کو عملی

روپ دینے کی کوشش کی۔ وہ تعلیم کے بارے میں ایک مکمل اور واضح نظریات رکھتے تھے۔ وہ فلسفہ کی تعلیم کو از کار رفتہ بیکار اور غیر ضروری سمجھتے تھے۔ وہ تاریخ میں صداقت کے قائل اور کسی بھی مقدار میں مبالغہ آرائی کے سخت خلاف تھے۔ اس نے تعلیم میں مکمل سچائی اور پوری ایمانداری کو ضروری کر دیا اور طلباء اور ان کے سرپرستوں کو استاد کی طرف سے دیجانے والی طفلی تسلیوں کو تعلیم کے لئے مضر قرار دیا۔ اس نے عربی زبان کی تعلیم پر خاص زور دیا اور ایک یا دو غیر ملکی زبانوں کی جانکاری کو مفید بتایا۔ اس نے قانون اور انتظامیہ کی تعلیم کو بھی ضرورت سمجھا تھا۔ وہ عملی اور مفید تعلیم پر توجہ دیتا تھا اور تعلیم میں ہر قسم کی نمائش و پوشش کا سخت مخالف تھا۔ وہ تعلیم کے عملی اور مشقی طور طریقوں کو خاص اہمیت دیتا تھا۔

دہلی سلطنت کے زوال کے بعد اور مغلیہ سلطنت کے قیام سے قبل بنگال، جونپور، کشمیر، مالوہ، گجرات اور خاندیش وغیرہ میں جو آزاد اور خود مختار ریاستیں قائم ہوئی تھیں انھوں نے بھی اپنے اپنے حدود میں اپنے وسائل و ذرائع کے مطابق تعلیمی ترقی کے اس عمل میں نمایاں دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اسی طرح مغلیہ سلطنت کے زوال کے نتیجہ میں جو آزاد اور خود مختار ریاستیں قائم ہوئی تھیں جیسے دکن کی بہمنی، عادل شاہی، احمد نگری، نظام شاہی، قطب شاہی، اودھ، رام پور، ٹونک، بھوپال اور دوسری ریاستوں نے اپنی آزادی و خود اختیاری کے وسائل کو بروئے کار لاکر ہندوستان میں شمال سے جنوب تک تعلیمی ترقی کا بگل بجاتی رہیں جس سے ہندوستان میں مسلمانوں کا رائج کردہ ایک مستحکم نظام تعلیم قائم تھا اور جو مسلمانوں کی دنیاوی اور دینی ضرورتوں کی پوری تکمیل تو نہیں کرتا تھا بڑی حد تک کارآمد تھا۔

تعلیم انگریزی عہد حکومت میں:- ۱۵۹۹ء میں لندن کے تاجرون نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی کمپنی قائم کرنے کا فیصلہ کیا جسے ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبیتھ نے مشرقی ملکوں میں تجارت کرنے کا اجازت نامہ (Charter) عطاء کیا۔ اس کمپنی کے تاجرون نے ۱۶۱۱ء میں

مچھلی پٹنم میں پہلا تجارتی کارخانہ قائم کیا۔ ۱۶۱۳ء میں دوسرا تجارتی مرکز گجرات کے شہر سورت میں قائم ہوا۔ ابتدا میں کمپنی کی تمام تر توجہات تجارت اور مذہبی تبلیغ تک محدود تھی۔ ۱۶۱۴ء میں کمپنی نے مذہبی تبلیغ کی تربیت (Training) کا بھی بندوبست کیا۔ اس طرح عہد جہانگیری میں محض تجارت کرنے کی غرض سے آئے انگریزوں نے اپنی مکاریوں اور عیاریوں کی بدولت اجازت حاصل کرلی اور تجارت کے بہانے پہلے عیسائی مذہب کی تبلیغ کی پھر ہندوستان کی تجارتی منڈیوں پر قبضہ اس کے بعد یہاں کی صنعت وحرفت کو تباہ کرنے کی غرض سے یہاں کے تمام مال کو برطانیہ پہونچانا شروع کیا اور کارخانوں کی حفاظت کے نام پر محافظ دستوں کی تعیناتی اور محافظ دستوں کے بہانے عسکری سازشیں کرنے لگے اور یہیں سے ان کے ظلم وستم اور جبر وتشدد کی شروعات ہونے لگی۔

۱۶۳۶ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں لارڈ آرک بی شپ (Arch Bishop Lord) نے عربی کا شعبہ قائم کیا جس میں ہندوستان آنے والے عیسائی مبلغوں کو باقاعدہ عربی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ۱۶۵۹ء میں کمپنی کے ڈسپیچ میں کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ہندوستان میں عیسائی مذہب کی تبلیغ واشاعت کے لئے ہر جہاز کے ساتھ عیسائی مشینری بھیجنے کے ارادے کا اظہار کیا۔ لیکن کمپنی کے آفیسروں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں کی چنانچہ ۱۶۶۸ء میں کمپنی کے سابقہ ارادے کو پھر دہرایا گیا جس کے نتیجہ میں کمپنی کو اپنے قلعوں، بستیوں اور کارخانوں کی حفاظت محافظ دستوں کی تقرری اور بڑے کارخانوں میں اسکول کے قیام کی اجازت دیدی اس طرح ہندوستان میں انگریز سیاسی اور معاشی اعتبار سے مظبوط اور مستحکم ہونے لگے اور ہندوستان میں مقیم انگریزوں کے بچوں کو تعلیم کی شروعات سے ہندستان میں جدید مغربی تعلیم کا بھی آغاز ہوگیا اور جیسے جیسے تعلیم کی ترقی ہونے لگی اور انگریزی تعلیم کا حلقہ بھی وسیع سے وسیع تر ہونے لگا۔

۱۶۶۸ء کے اجازت نامہ (Charter) کے مطابق مدراس اور ممبئی میں امدادی اسکول

(Charity School) قائم کئے گئے ان کے سارے اخراجات کمپنی ملازمین اور چندوں سے پورے کئے جاتے تھے۔ان اسکولوں میں بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی اور نصاب میں لکھنا پڑھنا حساب اور عیسائی مذہب کی تعلیم شامل تھی۔ ۱۶۷۳ء میں پہلا ہائر سکنڈری اسکول مدراس میں قائم ہوا تھا جو ثانوی تعلیم کا پہلا ادارہ تھا اور جہاں کمپنی ملازمین، انگریزوں پرتگالیوں اور اینگلو انڈین کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے اور ذریعہ تعلیم پرتگالی زبان تھی۔ ۱۷۱۵ء میں مدراس شہر میں سینٹ میریز چیریٹی اسکول قائم ہوا جس میں پروٹسٹنٹ یورپین کے بچے مفت تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ۱۷۱۷ء میں ہندوستانی بچوں کی تعلیم کے لئے کڈپور میں اینگلو ورناکیولر اسکول کا قیام ہوا اس طرح ہندوستان میں ڈچوں، انگریزوں، پرتگالیوں اور فرانسیسیوں نے اسکول کھول نے شروع کئے جس سے ہندوستان میں غیر ملکی یورپین کی تعلیم کا آغاز وارتقاء ہونے لگا۔

۱۸۱۲ء میں شہری فوج کے پادری اور ہندوستانی سپاہیوں کے بچوں کے لئے سنڈے اسکول کا قیام ہوا۔ ۱۷۱۹ء سے ۱۸۰۷ء تک ممبئی میں بہت سارے تعلیمی ادارے قائم ہو گئے۔ اتر پورب میں انگریز تاجر ۱۶۳۳ء میں داخل ہوئے اور ہری پور و بلاس پور میں اپنے تجارتی کارخانے قائم کئے لیکن ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی اور ۱۷۶۵ء میں مغل بادشاہ شاہ عالم سے بہار، بنگال اور اڑیسہ کی دیوانی کے اختیارات حاصل کرنے پر ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے تاجروں کو تعلیم سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور اگر چہ تھی بھی تو انگریزی ملازمین کے بچوں کو تعلیم دلانے تک محدود تھی۔

۱۷۶۵ء میں انگریز گورنر لارڈ کلائیو اور مغل بادشاہ معاہدۂ الہ آباد کی رو سے جب کمپنی کو بہار، بنگال اور اڑیسہ کی دیوانی کے اختیارات حاصل ہو گئے تو انگریزوں نے اپنے سیاسی تسلط قائم کرنے شروع کر دیئے۔ان علاقوں میں دیسی حکمرانوں نے تعلیم میں امید افزاء کام کئے تھے اور تعلیم کے فروغ کے لئے مکاتب، مدارس اور پاٹھ شالائیں قائم کی تھیں جہاں باقاعدہ تعلیم کا

بندوبست تھا اور ان میں درس وتدریس کی خدمات انجام دینے والے مولویوں اور پنڈتوں کو انعامات واعزازات دیئے جاتے تھے۔اس کے علاوہ ان تعلیمی اداروں پر جاگیریں بھی وقف ہوا کرتی تھیں۔ ۱۷۷۳ء کے ریگولیٹنگ ایکٹ کے مطابق کلکتہ میں ایک عدالت عظمیٰ (Suprime Court) کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۷۸۱ء کے ترمیمی قانون کے مطابق ہندوستانیوں کے مقدموں کا انکے مذہب اور رسم ورواج کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم ہوا۔لیکن انگریز جج ان چیزوں سے ناواقف تھے چنانچہ ان کی مدد کے لئے ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کی ضرورت محسوس کی گئی جس سے ہندوستانیوں کی تعلیم کے بارے میں بھی سوچا جانے لگا اور یہ فیصلہ لیا گیا کہ ہندوستانیوں کو اپنے اعتماد میں لیکر سیاسی تسلط کی توسیع کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ چنانچہ انھیں مقاصد کے پیش نظر کمپنی نے ہندوستانی ہندوؤں اور مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے اداروں کے قیام پر توجہ دی اور کلکتہ میں کلکتہ مدرسہ اور بنارس میں سنسکرت کالج کا قیام ہوا۔

۱۷۸۰ء میں وارن ہیسٹنگس (Waren Hastings) کے عہد گورنری میں کلکتہ مدرسے کا قیام ہوااور ایک غیر ملکی عالم مجیز الدین کو اسکا پرنسپل بنایا گیا۔اس مدرسہ میں چالیس طلبہ کی تعلیم ، قیام وطعام اور کتابوں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ۱۷۸۱ء میں طلبہ کی تعداد ڈھائی گنا ہوگئی ۱۷۸۵ء میں Rs. 2900/= کے سالانہ آمدنی کی زمین مدرسہ کے خرچ کے لئے وقف کی گئی۔لیکن انتظام کی کمی کے سبب ۱۸۱۹ء میں واپس لے لی گئی تیس ہزار روپئے (Rs. 30000/=) کی سالانہ گرانٹ منظور کی گئی اور مدرسہ کا انتظامی معاملہ ایک انگریز سکریٹری کو دیدیا گیا۔اس مدرسہ میں قرآن کے مذہبی اصول، علم اشیاء، فلسفہ، جیوتس ، ریاضی، منطق اور قواعد وعروض کی تعلیم دی جاتی تھی۔تعلیم کی مدت سات سال اور ذریعہ تعلیم عربی زبان تھی اور اساتذہ کے علاوہ قرآن کے الگ سے تعلیم کے لئے خطیب اور اذان دینے کے لئے موذن بھی مقرر تھے مدرسہ جمعہ کے دن بند رہتا تھا۔

۱۸۰۰ء میں لارڈ ولزلی (Lord Welesly) نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا جس کے قیام کا مقصد کمپنی کے ملازمین کو ہندو اور مسلم قوانین، ہندوستانی تاریخ، عربی، فارسی، سنسکرت، بنگلہ اور اردو زبان کی تعلیم دینا تھا۔ اس کالج نے بنگلہ اور اردو زبان کی ترقی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس کالج میں ڈاکٹر جان گل کرائسٹ (Dr. JN. Gilchrist) پرنسپل اور ڈاکٹر کیرے (Dr. Carey) کولیبروک (Coleberook) اور پنڈت ایشور چندودیا ساگر جیسے عالم و دانشور اساتذہ تھے۔ ۱۸۱۸ء میں اس طرز کا ایک دوسرا کالج مدراس میں بھی کھولا گیا ان دونوں کالجوں کے تعلیمی مقاصد اگر چہ کافی محدود تھے مگر زبان وادب کی ترویج واشاعت میں خصوصاً فورٹ ولیم کالج نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ اسی فورٹ ولیم کالج میں دیوناگری رسم خط میں لکھی جانے والی ایک نئی زبان ہندی کی شروعات کی۔ اسی ہندی زبان میں اس کالج نے باقاعدہ کتابیں تحریر کروائیں نہیں تو ہندوستان میں اس سے قبل ہندی نام کی کوئی اور زبان نہیں تھی اور موجودہ اردو ہی کو بعض علاقوں میں ہندی یا ہندوی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اسی طرح ان تعلیمی اداروں سے بھی منفی مقاصد کی تکمیل کی گئی اور ہندوستان میں لسانی اختلافات کی بھی شروعات کی گئی۔

انگریزی عہد میں سرکاری کوششوں کے علاوہ غیر سرکاری کوششیں بھی تعلیم کے لئے کی گئیں اور ہندوستان میں عیسائی مذہب کی توسیع واشاعت کے لئے تعلیم کو بطور آلہ استعمال کیا گیا چنانچہ اسی رامپور میں بیپ ٹیسٹ مشینری نے ۱۸۱۷ء تک کل ایک سو پندرہ اسکول کھولے۔ ۱۸۰۰ء میں ایک چھاپہ خانہ بھی قائم کیا اور بائبل کا مختلف ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور دوسری کتابوں کی اشاعت کر کے عوام میں تقسیم کیا گیا۔ ۱۸۰۸ء میں ''ہندوؤں اور مسلمانوں کے نام پیغام'' نامی کتاب شائع کی گئی جس میں نبی کریم حضرت محمدؐ کو جھوٹا پیغمبر اور ہندو مذہب کے خلاف ہتک آمیز باتیں لکھی گئیں چنانچہ اس کا ہندوؤں اور مسلمانوں میں زبردست ردعمل ہوا۔ ان

ردعمل اور غصہ کو فرو کرنے کے لئے لارڈ منٹو نے مشنریوں کا پریس ہی ضبط کرلیا اور انھیں گرفتار کر کے کلکتہ لایا گیا۔ ان مشنریوں کو کمپنی کے اس اقدام سے کافی مایوسی ہوئی اور ہندوستان میں اس کے خلاف کوئی احتجاج نہ کر پائے تو انگلینڈ میں اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا جس کی سربراہی چارلیس گرانٹ (Charlesgrant) نے کی جو کمپنی کے تاجر اور ملازم کی حیثیت سے تقریباً تیس سالوں تک ہندوستان رہ کر انگلستان جا چکا تھا اور اس نے ہی انگلینڈ کی ایشیائی رعایا کی سماجی حالت پر غور (On the state of society among the Asiatic subject of Great Britain) نامی کتاب لکھ کر ہندوستان کی صورت حال پر روشنی ڈالی جس کے نتیجہ میں ہندوستان میں جدید انگریزی تعلیم کے لئے راہ ہموار ہوئی۔ اس نے ہی ہندوستان میں جدید انگریزی تعلیم کا ابتدائی خاکہ تیار کیا تھا اور اسی بنا پر اسے ہندوستان میں جدید مغربی تعلیم کا بابائے آدم(Father of Modern Education in India) کہا جاتا ہے۔

<u>ہندوستان میں جدید مغربی تعلیم</u>:- چارلیس گرانٹ کی کتاب اور اس کے خیالات سے برطانوی پارلیامنٹ کے رکن ولبرفورس (Wilber Force) کافی متاثر ہوئے اور جب کمپنی کا اجازت نامہ تجدید کے لئے پارلیامنٹ میں پیش ہوا تو انھوں نے اس میں ایک تعلیمی دفعہ جوڑنے کے لئے برطانوی پارلیامنٹ میں ایک تحریری تجویز پیش کی جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ہندوستان میں برٹش انتظامیہ کا یہ لازمی اور خاص فرض بنتا ہے کہ تمام مناسب وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اور برٹش حکومت کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے اقدامات کرے جس سے ہندوستانیوں کے علم، مذہب اور اخلاق کا معیار بلند ہوسکے۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اس تجویز کی مخالفت کی جس پر برطانوی پارلیامنٹ کے ایک دوسرے رکن رینڈل جیکشن (Randle Jackson) نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے

امریکی نوآبادیات کو محض اپنی زبان اور مذہب کی تبلیغ واشاعت کے تحت کھودیا ہے اس لئے ہمیں ہندوستان میں ایسی بیوقوفی نہیں کرنی چاہیے چنانچہ ویلبر فورس کی تجویز نامنظور کردی گئی۔

ولبر فورس کی تجویز کی نامنظوری کے ردعمل کے طور پر برطانیہ میں چارلس گرانٹ اور اس کے ہمنواؤں نے زبردست احتجاجی تحریک کی شروعات کی جس میں ہندوستان میں انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم اور عیسائی مذہب کی تبلیغ کو خاص اہمیت دی گئی تھی جبکہ کمپنی کے ہندوستانی آفیسران ہندوستانیوں کو ان کی اپنی زبان میں تعلیم دینے کے حق میں تھے اور ان کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت کے حق میں نہیں تھے اور خود کمپنی کے ہائی کمان لارڈ منٹو ہندوستانی ادب وسائنس کا مداح تھا اس نے ۶ رمارچ ۱۸۱۱ء کے اپنے مراسلے میں کمپنی کے ڈائرکٹروں کو لکھا کہ ''ہندوستان میں ہندوستانی ادب وتعلیم کا روز بروز زوال ہوتا جارہا ہے جس سے بہت سی اہم کتابیں ضائع ہورہی ہیں۔ اگر سرکار نے فوری طور پر توجہ نہیں کی تو ہندوستان میں تعلیم کا رواج اور فروغ ناممکن بن جائیگا۔''

ہندوستان میں کمپنی کے ذمہ داروں اور برطانوی ڈائرکٹروں اور چارلس گرانٹ کے ہمنواؤں کے درمیان تعلیم کے معاملے پر ایک شدید فکری تنازعہ پیدا ہوگیا اور جب ۱۸۱۳ء میں کمپنی کا اجازت نامہ پارلیامنٹ میں تجدید کے لئے پیش ہوا تو اس پر کافی بحث ومباحثہ شروع ہوگیا اور دونوں مکتب فکر کے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے اس میں ایک ایک دفعہ شامل کردی گئی اور ہندوستان میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لئے جہاں ہر طرح کی چھوٹ دی گئی وہیں ہندوستانیوں کی تعلیم کو کمپنی کی ذمہ داری قرار دی گئی۔ اور کم از کم ایک لاکھ روپیہ اس کے لئے سالانہ خرچ کرنے کی شرط لگادی گئی۔ اس طرح ۱۸۱۳ء کے اجازت نامہ چارٹر کے مطابق ہندوستان میں سرکاری تعلیمی کوششوں کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ لیکن تعلیم پر سرکاری رقم کے خرچ کے طور طریقوں کو لیکر تنازعہ کھڑا ہوگیا جس سے تعلیمی مد کیلئے منظور ایک لاکھ روپیہ کی رقم کافی دنوں تک التواء میں

پڑی رہی۔ ہندوستان میں تعلیم کی سرکاری سرپرستی اور عیسائی مذہب کی کھلی تبلیغ نے ہندوستانی معاشرے میں جہاں تعلیم کے فروغ کے لئے راہ ہموار کی وہیں ہندو مسلمان اور عیسائیوں میں ایک نئے تصادم اور ٹکراؤ کی صورت پیدا کر دی جو دراصل انگریزوں کی قدیم کلیسائی پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی ہی دین تھی۔

۱۸۲۳ء میں گورنر جنرل کی تجویز کے مطابق عوام کی بہتر تعلیم کے انتظام کے غرض سے ایک عوامی کمیٹی "مجلس تعلیم عامہ" (General Committee of Public Instruction) کی تشکیل کی گئی اس کمیٹی کی مشرقی روایتی تعلیمی پالیسیوں کی بعض ہندوستانی مفکروں نے مخالفت کی جس میں سرفہرست نام مشہور ہندو مصلح، مفکر اور تعلیمی دانشور راجا رام موہن رائے کا تھا۔ انہوں نے ہندوستان میں انگریزی زبان وادب اور جدید مغربی تعلیم و سائنس کی توسیع کی حمایت کی کیونکہ انکا خیال تھا کہ ہندوستان میں جدید بیداری اور ترقی لانے کے لئے یورپی تعلیم وسائنس ضروری ہے چنانچہ انھوں نے ۱۱ر ستمبر ۱۸۲۳ء میں اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ امہرسٹ (Lord-Amherst) کو اپنا مشہور تعلیمی مراسلہ تحریر کیا جس میں انہوں نے کلکتہ میں مجوزہ سنسکرت کالج کے قیام کی مخالفت اور ہندوستان میں ایک وسیع تر تعلیمی منصوبہ کے تحت جدید علوم وخصوصاً ریاضی، نیچرل سائنس، کمیسٹری اور دیگر جدید سائنسی علوم کی تعلیم پر زور دیا مگر ان کے اس تعلیمی مراسلہ پر کوئی توجہ نہیں دی گئی اور کلکتہ میں سنسکرت کالج کے قیام کے منصوبہ کی تکمیل کر دی گئی۔ ۱۸۲۴ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اپنے ہدایت نامہ کے ذریعہ ہندوستان میں کمپنی کی ظرف سے تعلیمی اداروں کے قیام اور ہندوستانیوں کی تعلیم کے انتظام کی ہدایت دی اور قدیم ہندوستانی علوم کی جگہ جدید مغربی علوم وسائنس کی ترویج پر زور دیا جس کے نتیجہ میں کلکتہ مدرسہ، بنارس سنسکرت کالج اور آگرہ کالج میں مشرقی علوم کے ساتھ انگریزی تعلیم کو بھی جوڑ دیا گیا اور دلی اور بنارس وغیرہ میں ضلع انگریزی اسکولوں کی تعمیر ہوئی۔

۱۸۱۸ء میں آخری پیشوا کی شکست کے بعد ممبئی پریسیڈنسی قائم ہوئی اور ۱۸۱۹ء میں الفسٹن کو وہاں کا گورنر نامزد کیا گیا اس نے پیشوا کے پانچ لاکھ روپیہ کے سالانہ امدادی فنڈ سے ۱۸۲۱ء میں پونہ سنسکرت کالج کی تعمیر کروائی۔ اور دکنی برہمنوں کو خوش کرنے کی غرض سے انتہائی چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ۱۸۲۳ء تک کوئی دوسرا تعلیمی کام نہیں کیا۔ اسی سال ممبئی اور ہندوستانی تعلیمی کمیٹی نے سرکار سے مالی گرانٹ کی اپیل کی اور ۱۳؍دسمبر ۱۸۲۳ء کو ممبئی کے گورنر نے اپنا مشہور تعلیمی مراسلہ تحریر کیا جس میں تعلیم کے فروغ سے متعلق کئی نکاتی مشورے بھی شامل تھے۔ جس میں ہندوستانی اسکولوں کے طریقۂ تعلیم میں اصلاح، اسکولوں کی تعداد میں اضافہ، نصابی کتابوں کا انتظام، غریبوں کی تعلیمی حوصلہ افزائی، مغربی تعلیم وسائنس کے لئے نئے کالجوں کا قیام، ہندوستانی زبان میں اخلاقیات اور فزکس کی کتابیں تصنیف کرانے پر زور اور انکی اشاعت کا انتظام۔ انگریزی زبان میں اعلیٰ تعلیم اور تحقیقات جیسے اہم تعلیمی مشورے و مطالبے شامل تھے۔

بمبئی کے گورنر الفسٹن عام ہندوستانیوں کی تعلیم کے حق میں تھے لہٰذا انھوں نے تعلیم کی سرکاری اور نجی دونوں کوششوں کی حوصلہ افزائی کی تھی انھوں نے سرکار کے ذریعہ اسکولوں کی تعمیر اور تعلیمی کمیٹیوں کو مالی امداد (گرانٹ) کو اہمیت دی جس سے ہندوستان میں تعلیمی گرانٹ سسٹم (Grant in Aid System) کا رواج ہوا۔ لیکن ان کے اس تعلیمی طریقۂ کار کو خود انھیں کی کانسل کے ایک رکن وارڈن (Warden) نے نامناسب بتاتے ہوئے اس کی سخت مخالفت کی اور ۲۴؍دسمبر ۱۸۲۳ء کے اپنے تفصیل نامہ میں تحریر کیا کہ عام لوگوں کو ہندوستانی زبان میں تعلیم دینے کے بجائے اونچے طبقے کو انگریزی زبان میں تعلیم دینا زیادہ کارآمد ثابت ہوگا۔ وارڈن کی عام تعلیم کی اس مخالفت کے نتیجہ میں کچھ ہی دنوں بعد ایک نیا تعلیمی تنازعہ کھڑا ہوگیا جسے اینگلو ورنا کیولر تنازعہ (Anglo Verna Culer Controversy) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے الفسٹن کی عام تعلیم کی پالیسی کو پسند نہیں کیا اور صرف بمبئی

تعلیمی کمیٹی کو چھ سو (600/=) روپے ماہانہ گرانٹ دی گئی۔ اور ۱۸۳۳ء تک تعلیم کے معاملہ میں کوئی خاص قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا گیا۔

ریاست مدراس میں منرو کے تعلیمی سروے سے جو صورت حال سامنے آئی تھی اس کے مطابق تعلیم کی عدم ترقی کے سبب اساتذہ میں نااہلیت، غربت وافلاس اور سرکار سے عدم تعاون کا رجحان لوگوں میں عام تھا چنانچہ اس نے اپنے ۱۰ رمئی ۱۸۲۸ء کے تفصیل نامہ میں تجویز پیش کی تھی کہ ریاست کے بیس (۲۰) ضلعوں میں اعلیٰ تعلیم کے دو دو اسکول ایک ہندوؤں کے لئے اور ایک مسلمانوں کے لئے کھولے جائیں اس کے علاوہ ریاست میں انگریزی تعلیم کے لئے ہر تحصیل میں ایک ایک ورنا کیولر اسکول اور اساتذہ کی تعلیمی تربیت کیلئے ایک ٹریننگ اسکول کا بھی قیام کیا جائے۔ اس نے اساتذہ کی تنخواہ میں اضافہ اور نصابی کتابوں کی تعلیمی اشاعت کی بھی سفارش کی تھی اور اپنے تعلیمی منصوبے کی تکمیل کے لئے کمپنی سے اڑتالیس ہزار (Rs.48000/=) سالانہ مالی امداد کا بھی مطالبہ کیا تھا۔ جسے ۱۸۲۸ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں کی منظوری بھی مل گئی تھی مگر اس منظوری سے قبل ہی وہ اس دنیا سے ہی چلا گیا اور اس کے تعلیمی ترقی کے منصوبوں پر عمل درآمد کرنے کی ذمہ داری مجلس تعلیم عامہ کے سپرد کردی گئی لیکن مجلس تعلیم عامہ کے اراکین میں تعلیمی ترقی کی وہ اسپرٹ نہیں تھی جو منروں میں تھی پھر بھی ریاست میں ایک نارمل اسکول اور ۱۸۳۰ء تک صرف اکسٹھ تحصیلی وضلعی اسکول ہی قائم رہے اور وہ بھی اساتذہ کی معمولی تنخواہ اور مناسب تعلیمی نگرانی نہ ہونے کے سبب بہتر نتائج دینے سے قاصر رہے۔

منرو ہندوستان میں صحیح اور مناسب تعلیم کے حق میں تھا لیکن کمپنی میں بیٹھے ہوئے بقال بھلا کب ایسا ہونے دیتے انکا مطلب تو صرف یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو کلرک بنا کر ہندوستان میں اپنا وفادار اور کمپنی کا ایجنٹ بنایا جائے۔ انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کبھی بھی ہندوستانیوں کے تعلیمی

مفاد میں نہیں رہی۔ چنانچہ بعض انگریز دانشوروں اور ادیبوں نے بھی اس تعلیمی پالیسی کو کمیوں اور خامیوں سے پر کہا تھا جس میں ہیمپٹن (H.V. Hampton) اور الکزنڈر آر ہتھناٹ (Alexender Arhuthnot) وغیرہ کا نام سرفہرست ہے۔ منرو کی تعلیمی اسکیم بڑی حد تک ہندوستانیوں کی صحیح تعلیمی ترقی کے مفاد میں تھی اسکی تیار کردہ تعلیمی اسکیم پر ابھی عملی اقدام چل ہی رہا تھا کہ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اپنے ۲۹ ستمبر ۱۸۳۰ء کے مراسلہ میں لکھ بھیجا کہ مدراس میں تعلیم کا کام مکمل ہو گیا۔

ہندوستان میں سب سے پہلا تعلیمی سروے ایک غیر سرکاری شخص سر ولیم ایڈم (Sir William Adam) نامی مشنری نے کیا تھا جو ایک یوروپی عیسائی مبلغ تھے اور جنہیں سنسکرت اور بنگلہ زبان وادب کے مطالعہ اور معروف ہندوستانی مفکر راجہ رام موہن رائے سے تعلق کے بنا پر ہندوستانی تعلیم سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس نے اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک (Lord William Bentinck) سے ہندوستان میں تعلیمی جانچ کی اجازت مانگی اور لارڈ ولیم بینٹنک کی اجازت سے ۱۸۳۵ء سے ۱۸۳۸ء تک اپنی تین تعلیمی رپورٹیں پیش کیں جو ہندوستانی تعلیم کی تاریخ میں سر ولیم ایڈم کی پہلی، دوسری اور تیسری رپورٹ کے نام سے مشہور ہیں اور جس سے اس زمانہ کی تعلیمی صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔

میکالے کی تعلیمی پالیسی کے اثرات:- ۱۰ر جون ۱۸۳۴ء کو لارڈ میکالے گورنر جنرل کی کونسل کے قانونی رکن کی حیثیت سے ہندوستان آیا وہ انگریزی زبان وادب کا زبردست عالم تھا اور اپنی تحریروں اور تقریروں کے لئے کافی شہرت رکھتا تھا اور انگریزی زبان کو عالمی زبان کی حیثیت دلانے کے لئے اپنی جدوجہد میں بے مثال تھا۔ اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک نے اسے مجلس تعلیم عامہ کا سربراہ نامزد کر دیا اور اس سے ۱۸۱۳ء کے چارٹر میں تعلیم سے متعلق دی گئی ہدایتوں سے متعلق وضاحت کرنے کو کہا چنانچہ ۲ر فروری ۱۸۳۵ء کو اس نے

اپنا وضاحت نامہ گورنر جنرل کو پیش کیا جس میں مشرقی علوم وفنون کی مخالفت اور انگریزی علوم وسائنس کی زبردست وکالت کی گئی تھی اس نے یہ بھی کہا کہ ''ہندوستان کی دیشی زبانوں میں ادب وسائنس کا فقدان ہے۔ وہ غیر ترقی یافتہ اور گنوار و حیثیت کی زبانیں ہیں اور جب تک انھیں خارجی معلومات سے پر نہیں کیا جائے گا ان میں کسی اہم کتاب کا ترجمہ بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔'' اس نے مزید آگے یہ بھی لکھا کہ ''ایک یوروپی لائبریری کی ایک الماری ہندوستان اور عرب کی تمام کتابوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔'' لارڈ میکالے کی یہ باتیں اسکی شدت پسند مغربیت اور ہندوستان وادب کی علمی سرمائے سے ناواقفیت اور مغربی ترقی پر غرور کا نتیجہ تھیں۔ اسے شاید تاریخ کی یہ سچائی نہیں معلوم تھی اور اگر معلوم تھی تو وہ ترقی کے غرور میں جان بوجھ کر نظر انداز کر گیا تھا کہیں کہ جس مغربی علوم وسائنس کا اسے گھمنڈ ہے وہ دراصل عرب سائنس دانوں کی ہی دین تھی جو اندلس، قرطبہ اور اسپین میں انکے تعلیمی اداروں اور تعلیمی سرگرمیوں کی بدولت پہونچے تھے عرب حکماء، معلمین اور سائنس دانوں نے ہی یورپ میں عصری علوم کی روشنی پہونچائی تھی اور یورپ کی پہلی یونیورسٹی قرطبہ (Cardwa) عربوں کی ہی قائم کردہ ہے اور جس کا اعتراف بہت سارے انگریز مفکرین ومورخین نے بھی کیا ہے۔ بہرحال لارڈ میکالے نے انگریزی علوم وسائنس کی زبردست وکالت کی جس سے ہندوستان میں جدید انگیریزی علوم اور انگریزی ذریعہ تعلیم کی پالیسی کو اپنالیا گیا۔ لارڈ میکالے کی اس تعلیمی پالیسی نے ہندوستان کی کلاسیکی زبانوں جیسے سنسکرت، فارسی اور عربی تعلیم کے سارے راستے مسدود کردیے اور ہندوستان میں صدیوں سے چل رہے مشرقی علوم کے مدارس عصری تعلیمی ترقی کی دوڑ سے کٹ گئے مگر اپنا تعلیمی کام انجام دینے میں لگے رہے۔

انگریزوں اور لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی دراصل بدنیتی پر مبنی تھی جسے ہندوستانی سمجھتے بھی تھے مگر وقتی مصلحت اندیشی اور یوروپی تعلیمی ترقی سے واقفیت کی خواہش میں خاموشی اختیار کئے

رہے۔ جبکہ ہندوستانی مسلمانوں نے اسے اپنے مذہب وتمدن اور عقیدے کے خلاف تصور کرتے ہوئے اس کی مخالفت کرتے رہے جس کا اصل مقصد انگریزی اور عصری علوم کی مخالفت نہیں تھی بلکہ انگریزوں کی بدنیتی پر مبنی تعلیمی پالیسی کی مخالفت تھی جس سے وہ ہندوستانیوں کو اپنا ہمنوا بنا کر انھیں اپنی اخلاقیات وروحانیات اور عقائد وتمدن سے بیگانہ بنا کر مغربی تہذیب وثقافت کا دلدادہ اور انگریزوں کا ہمنواں بنانا چاہتے تھے تاکہ ان کی بدولت وہ ہندوستان پر ہمیشہ ہمیشہ قابض رہ سکیں۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی ہندوستان میں نافذ ہوگئی اور عیسائی مشنیریاں جو پہلے سے ہی اسلام مخالف پروپیگنڈہ میں سرگرم عمل تھیں ان میں شدت پیدا ہوگئی اور اسلام اور مسلمان پر چوطرفہ حملہ شروع ہوگیا۔

۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بینٹنگ گورنر جنرل کے عہدے سے مستعفی ہوکر انگلستان چلے گئے انکے ہندوستان سے جاتے ہی مشرقی تعلیم کے ہمنواؤں نے آواز اٹھانی شروع کردی اور لارڈ آک لینڈ (Lord Auck Land) گورنر جنرل نے میکالے کی تعلیمی پالیسی کا بغور جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجہ پر پہونچے کہ تنازعہ کی اصل بنیاد مالی امداد ہے چنانچہ انھوں نے ۲۴ رنومبر ۱۸۳۹ء کو اپنے تفصیل نامہ میں مشرقی علوم کی قدر حوصلہ افزائی کی حمایت کی اور مالی بجٹ میں اکتیس ہزار (Rs.31000/=) کا اضافہ کرکے مشرقی علوم وسائنس کی حوصلہ افزائی کرکے سارے معاملے کو ہی ٹھنڈا کردیا اور ہندوستان میں مغربی علوم وسائنس کی مخالفت کی شدت میں کی کمی واقع ہوگئی۔

۱۸۵۳ء میں کمپنی کے چارٹر کی تجدید کے وقت برطانوی پارلیامنٹ یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ اب ہندوستانیوں کی تعلیم کو دیر تک نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ہندوستان میں مستحکم تعلیمی پالیسی وضع کرنے کے لئے ایک تعلیمی کمیٹی کی تشکیل کی جو ”Of the house of common select committee.“ کے نام سے جانی جاتی

تھی۔ اس کمیٹی نے ہندوستان میں تعلیم کا جائزہ اور ٹریویلین (Trevelyen) مارش مین (Marshman)، ولسن (Wilson)، ہیلی ڈے(Helliday) اور ڈف (Duff) جیسے تعلیمی ماہرین کے خیالات کا جائزہ لیا اور ۱۸۵۴ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں کی طرف سے نئی ہندوستانی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا گیا اس وقت چارلس ووڈ (Charles Wood) کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کا سربراہ ہو چکا تھا چنانچہ اسی کے نام پر کمپنی کی نئی تعلیمی پالیسی ووڈ اعلانیہ (Wood Despatch) کے نام سے جاری کی گئی جس میں کل ۱۰۰ نکات شامل تھے۔ ووڈ اعلانیہ سے ہندوستانی تعلیم کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور ہندوستان میں تعلیم کے فروغ کے لئے نئی راہ ہموار ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے لئے کولکتا، ممبئی اور مدراس میں یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ گرانٹ سسٹم لاگو ہوا۔ انگریزی حکمرانی کے صوبوں میں ہی محکمۂ تعلیمات کھولے گئے وظائف دینے کا رواج ہوا مگر دیشی زبانوں کی اندیکھی، ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کی تضحیک، ہندوستانی تاریخ وادب کی تذلیل، عیسائیت کی جارحانہ تبلیغ اور مغربیت کی برتری کی پالیسی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی جس سے ہندوستانیوں خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کے متعلق جو شکوک وشبہات تھے اس میں مزید شدت پیدا ہوگئی کیونکہ انگریز حکمرانوں نے جو تعلیمی شعبے اور ادارے قائم کئے تھے ان میں نہ تو ہندوستانیوں کو کوئی نمائندگی دی گئی تھی اور نہ ہی تعلیمی مفادات کا ہی خیال رکھا گیا تھا انگریزی کے ذریعہ رائج تعلیمی نظام میں ذہن وفکر میں وسعت وہمہ گیری پیدا کرنے کے بجائے رٹنے والے غیر مفید تعلیمی طریقہ کی اہمیت تھی اور علم وآگہی اور معلومات کی جانچ پرکھ کے لئے جو امتحانی طریقے اپنائے گئے تھے وہ غیر فطری طریقۂ معیار تھا جس سے ہندوستانیوں کو تعلیم یافتہ بنانے کے بجائے سند یافتہ بنانے کی دوغلی پالیسی کو اہمیت حاصل تھی۔

کمپنی کی نئی تعلیمی پالیسی عیسائی مشنریوں کی کھلے عام ہندوستانی مذہب وتہذیب اور زبان

وادب کی تذلیل نے ایک معاشرتی انتشار کو ہوا دی۔ ہندوستانی صنعت وحرفت کی تباہ کن سرکاری پالیسی ومنصوبے سے ہندوستانی پیشے تباہ ہو چکے تھے اور ہندوستانی بنکروں کے بنائے ہوئے نفیس اور ہنرمندانہ کپڑے جن کے آگے لندن اور مانچسٹر کے کپڑے ماند پڑ جاتے تھے کو تباہ کرنے کیلئے ہندوستان میں موجود خام مال کے سارے وسائل کو اپنے قبضہ میں کر کے انگلستان بھیجنے کی حکمت عملی سے ہندوستان میں ہزاروں سال سے موجود ہینڈلوم کی تاریخی صنعت ہی برباد ہو کر رہ گئی جس سے اس صنعت سے وابستہ لاکھوں اور کروڑوں لوگوں کی معاشی حالت بگڑ گئی اور ہندوستانی معاشرہ تعلیمی وتہذیبی انتشار کے ساتھ ساتھ معاشی اور اقتصادی انتشار کا شکار ہو گیا اور ان سب کے نتیجے کے طور پر سیاسی بغاوت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

۱۸۵۷ء سے قبل اس پورے تعلیمی تاریخ کے تناظر میں نہ کہیں خلوص دل سے مسلمانوں کی تعلیم کے بندوبست پر توجہ دی گئی اور نہ ہی مغلوں کے عہد سے جاری انکے تعلیمی اداروں اور تعلیمی طریقوں میں بہتری پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی جبکہ اس دور میں بھی مسلمانوں کا محدود پیمانے پر ہی سہی اپنا سابقہ تعلیمی کام جاری تھا۔ قدیم اسلامی مدارس سیاسی زوال کا شکار ہو چکے تھے اور جو چند مدارس اپنی تعلیمی خدمات میں لگے ہوئے تھے اس پر بھی انگریزوں کی ترچھی نظریں پڑتی تھیں مگر ہندوستان میں مسلمانوں کے سابقہ تعلیمی طریقے پھر بھی جاری تھے اور ان میں قدامت پسندی، طریقۂ تعلیم اور نصاب وغیرہ کی یکسانیت اور زمانے کی ہوا سے محفوظ رکھنے کی کوششوں سے دوسری بہت سی کمیاں در آئی تھیں۔

شمالی ہندوستان میں دہلی کالج کی اپنی خاص اہمیت تھی یہی وہ دہلی کالج ہے جس میں جدید علوم کی شمولیت کے بعد تعلیم کے حصول کے لئے شاہ عبدالعزیز نے فتویٰ دیا تھا۔ سرسید احمد خان اور مولانا محمد قاسم نانوتوی اسی کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور دونوں ہی مولانا مملوک علی کے شاگرد رشید تھے اس طرح دونوں استاذی بھائی تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے قائم کردہ مدارس

اپنے طور پر تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے اور ان مدرسوں کے فارغین قطب الدین ایبک سے بہادر شاہ ظفر تک بلکہ انگریزی عہد میں بھی مسلمان قاضیوں اور صدروں کے ہاتھوں میں رہے۔ مسلم حکمرانوں کے قائم کئے ہوئے بیشتر مدارس مغلیہ حکومت کے زوال پذیر ہونے کے بعد بھی اپنے طور پر تعلیم و تعلم کے کاموں میں لگے رہے اور ان کے تمام تر اخراجات مقامی حکمراں، امراء، جاگیردار اور رؤسا حضرات برداشت کرتے رہے اور دہلی، آگرہ، اودھ، رام پور، گجرات، اجمیر، بنگال، بہار دکن، مالوہ، ملتان، کشمیر، بیدر، گول کنڈہ، مدراس، ممبئی، میسور، بھوپال، ٹونک غرض کہ پورے غیر منقسم ہندوستان میں مصروف عمل رہے اس کے علاوہ شخصی اور انفرادی طور پر بھی اساتذہ اپنے اپنے مستقر پر درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے اور معلمین کی مدد معاش مقامی نوابوں، راجوں، تعلقداروں، امیروں یا رئیسوں کی جانب سے جاگیریں وقف کر کے یا وظائف مقرر کر کے ہوتی رہیں اس طرح سرکاری اور غیر سرکاری طور پر ہندوستان کا تعلیمی نظام ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی سے قبل تک بتدریج جاری و ساری رہا اور ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کو کسی نہ کسی حد تک پورا کرتا رہا۔

پہلی جنگ آزادی کے بعد کے تعلیمی حالات:- ہندوستان میں انگریز حکمرانوں کی ہندوستانی مخالفت متعصبانہ پالیسیوں، ہندوستانی صنعت و حرفت کے لئے تباہ کن سازشوں، دیسی حکمرانوں کے ساتھ نازیبا سلوک، ہندوستانی دولت و وسائل کا ہندوستان کے بجائے برطانیہ کے مفاد میں استعمال۔ لالچ اور زور زبردستی سے غریب ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کی کوشش، ہندوستانی تعلیم و تہذیب کی تضحیک ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ امتیازی سلوک، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی عقائد پر حملے، مذہب و عقیدہ اور رسم و رواج کی تذلیل، ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی جگہ مغربی تہذیب و تمدن کے نفاذ کی سعی، معاشی اور اقتصادی اعتبار سے ہندوستانیوں کو مفلوج بنانے کی سازش، اہم سرکاری عہدوں پر ہندوستانیوں کی عدم تقرری، ہندوستان کے ہندو

مسلمان کے تشخص کا خاتمہ کر کے عیسائی بنا دینے کے لئے اقتدار کا ناجائز استعمال اور ہر طرح کی لوٹ گھسوٹ کے ردعمل کے طور پر ۱۸۵۷ء کی عوامی بغاوت رونما ہوئی تھی جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا لیکن اصل میں وہ ہندوستانیوں کی انگریزوں سے نجات کی پہلی عوامی کوشش تھی اس لئے اسے پہلی جنگ آزادی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس پہلی جنگ آزادی میں اگر دلی محاذ پر بہادر شاہ ظفر، جھانسی میں رانی لچھمی بائی، کانپور میں نانا صاحب، لکھنؤ میں بیگم حضرت محل وغیرہ دیسی حکمراں انگریزوں سے برسر پیکار تھے تو عوامی محاذ پر ہندوستانی دانشور، علماء ڈٹے ہوئے تھے چنانچہ شاملی کے میدان میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حافظ ضامن علی شہید اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جیسے علماء تھے جو اپنی بہادری اور قوت ایمانی کی بدولت غیر تربیت یافتہ فوجی حکمت عملی سے انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیے تھے۔

۱۸۵۷ء کی یہ عوامی بغاوت کوئی وقتی اور ہنگامی حادثہ نہیں تھا بلکہ انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے دلوں میں برسوں سے سلگنے والی اس آگ کا نتیجہ تھی جس کی شروعات برسوں پہلے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں میں جو نفرت اور بغاوت کے جذبات پیدا کر دیئے تھے اسی سے ہوگئی تھی اور جس کو دہلی کی اکبرآبادی مسجد میں رہ کر پڑھنے والے ایک مجاہد سید احمد شہیدؒ نے پروان بڑھایا تھا۔ یہ ولی اللہی تحریک انگریز حکمرانوں کے لئے سوہان روح بن گئی تھی۔ سید احمد شہید نے ۱۸۱۸ء سے ۱۸۳۱ء تک ہندوستان کے ایک بڑے علاقے کا دورہ کیا تھا اور ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں انگریزوں کی عیاریوں اور مکاریوں کے خلاف ایک ایسی نفرت کی آگ بھر دی تھی جس کا نتیجہ ۱۸۵۷ء کی اس عوامی بغاوت کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ انھوں نے ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد کو مستحکم بنانے کے لئے کوششیں کی تھیں وہ مہاراجہ گوالیار کے یہاں مہمان بھی رہے اور ہندوستان کی آزادی اور قومی بیداری کے

لئے زبردست جد جہد کی تھی۔

۱۸۵۷ء کی اس پہلی جنگ آزادی میں بعض وجوہ کی بنا پر ہندوستانیوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ بہادر شاہ ظفر جن کی حکمرانی صرف لال قلعہ کے اندر تک محدود تھی وہ بھی ختم ہوگئی تھی۔ بادشاہ کو گرفتار کر کے رنگون بھیجدیا گیا تھا اور ہندوستان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کردیا گیا تھا۔ بغاوت کی ناکامی کے سبب جہاں ہندوستانی مسلمانوں میں احساس شکست خوردگی، ناکامی ومحرومی، احساس کمتری اور عدم تحفظ جیسے احساسات نے جڑ پکڑلی تھی وہیں سیاسی اور معاشی حالت کی تباہی اور اقتصادی زبوں حالی انکا مقدر بن گئی تھی کیونکہ بغاوت کی تباہی تو تھی ہی بغاوت کے بعد کے حالات اس سے زیادہ خطرناک رخ اختیار کر گئے تھے۔ انگریز اپنی انتقامی کاروائی میں مذہب، اخلاق اور انسانیت سب کچھ بھول گئے تھے اور ایسے ایسے انسانیت سوز اقدامات کررہے تھے کہ آج بھی تاریخ کے اوراق ان کی بربریت، سفاکیت، شیطانیت اور وحشی پن پہ ماتم کناں ہیں۔ مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، تمدنی اور معاشی زندگی کے ساتھ ساتھ تعلیمی زندگی بھی زیروزبر ہوچکی تھی اور پوری مسلمان قوم ذلت وناکامی کے قعر مذلت میں گر کر تباہ حال تھی سب پر سکتہ کا عالم طاری تھا اور ''اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی'' کی صورت حال پیدا ہوگئی تھی اور بقول رام گوپال'' ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کے ناگفتہ بہ اثرات کی وجہ سے ملک میں تقریباً دس سال سے کچھ زائد عرصہ تک جمود کا عالم طاری تھا'' اور ایسا لگتا تھا سارے ہندوستانی مسلمانوں کو سانپ سونگھ گیا ہو ایسے میں مولانا محمد قاسم اور سر سید احمد خاں اٹھے اور ہندوستانی مسلمانوں کے مردہ پڑے جسم میں روح پھونکنے کے لئے آواز لگائی اور ان میں زندگی کی حرکت پیدا کرنے کے لئے ایک نے اپنے پرانے اور قدیم ہتھیار کی مرمت کرا کر اس سے کام لینے کا مشورہ دیا تھا تو دوسرے نے دشمن کے ہی ہتھیار لیکر اسی سے دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے حکمت عملی تیار کی۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے تو براہ راست اس جنگ میں انگریزوں کے خلاف جنگ کی تھی اور شاملی کے محاذ پر ہندوستانی باغیوں کی سپہ سالاری کے فرائض انجام دیئے تھے جبکہ سرسید نے خود اپنی آنکھوں سے سارے واقعات دیکھے تھے اس لئے ان دونوں نے مسلمانوں کی اصلاح اور انکی تعلیمی وتمدنی زندگی کو از سر نو زندگی بخشنے کا بیڑہ اٹھایا۔ مولانا محمد قاسم نے دیوبند تحریک چلا کر مسلمانوں میں اپنے مذہب وعقیدہ کے تحفظ کے احساس پیدا کئے اور اسلام اور اسلامی ثقافت کے احیاء کو ضروری سمجھا اور غریب مسلمانوں کو اپنے مذہب وعقیدہ پر کار بند کرنے اور اسلامی تشخص کو بچانے پر زور دیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ سیاسی غلامی تو ہمارے گلے میں پڑ ہی چکی ہے اس لئے قوم کو ذہنی غلامی سے بچا کر اسے آئندہ سیاسی غلامی سے بھی نجات دلائی جاسکتی ہے۔ ذہنی غلامی سیاسی غلامی سے کہیں زیادہ مضر اور خطرناک ہوتی ہے جس کی مثال اندلس واسپین کی صورت میں ان کے سامنے موجود تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تحریک کے مرکز ونمونہ کے طور دارالعلوم دیوبند کا قیام کیا۔ جبکہ سرسید احمد خاں بھی تمام حالات کے چشم دید گواہ تھے انھوں نے مسلمانوں کو مزید تباہی سے بچانے کے لئے ''اسباب بغاوت ہند'' نامی کتاب لکھکر بغاوت کی تمام تر ذمہ داری کو انگریز حکمرانوں کی نااہلی قرار دیا تھا۔ سرسید طبقہ امراء کے نمائندے تھے اس لئے وہ امراء اور متوسط طبقہ کی معاشی تباہ حالی سے متاثر تھے انھوں نے ان میں زندگی کی حرکی قوت پیدا کرنے کے لئے اور انگریزوں کی لائی ہوئی جدید تعلیم حاصل کر کے ان کی معاشی زبوں حالی کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ وہ اقتصادی بدحالی کو تمام خرابیوں کی جڑ تصور کرتے تھے چنانچہ انھوں نے مسلمانوں میں بیداری لانے کے لئے علی گڈھ تحریک چلائی اور علی گڈھ میں ایم.اے.او. کالج قائم کیا تھا جو آگے چل کر مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی سرسید احمد خاں دونوں ملت اسلامیہ کے معاملات میں انتہائی مخلص، دردمند دل رکھنے والے اور قومی حمیت سے پر تھے۔

پہلی جنگ آزادی کے بعد دس سالوں سے زائد عرصہ تک سکتہ کا عالم طاری تھا مسلمان پورے طور پر تباہ و برباد ہو چکے تھے ہزاروں بلکہ لاکھوں علماء، دانشور اور عام لوگ شہید کر دیے گئے تھے۔ تمام تجارتی، تہذیبی اور تعلیمی ادارے تباہ کر دیے گئے تھے ایسے میں پوری قوم ڈری سہمی اور مایوسیوں و محرومیوں کا شکار ہو چکی تھی اور ایسی ناکامی و نامرادی کی حالت میں انسان کا آخری سہارا اس کا خدا ہی ہوتا ہے چنانچہ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اسی آخری سہارے کو سہارا بنا کر اور مذہب و عقیدہ اور روحانیت و اخلاقیات کے سہارے دیوبند تحریک کا آغاز کیا اور اپنے رفقاء کے توسط سے مسلمانوں میں مذہبی اور روحانی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی کیونکہ جنگ کی تباہ حالی میں ظالم انگریزوں نے مسلمانوں کے تعلیمی ادارے بھی تباہ کر دیے اور ان کی تہذیب و ثقافت، مذہب و عقیدہ اور اخلاقیات و روحانیات کو زندہ کرنے کے لئے مذہبی تعلیمی ادارہ کے قیام کی ضرورت تھی تاکہ مذہب و عقیدہ اور شریعت و ثقافت کا احیاء ممکن ہو سکے کیونکہ ہارٹاگ رپورٹ کے مطابق "بیرونی حملوں اور مہلک جنگوں کے طویل عرصہ کے بعد انیسویں صدی عیسوی میں تعلیم تزلزل کی حالت میں تھی۔ ابھی مغربی تعلیم پورے طور پر رائج نہیں ہوئی تھی اور دیشی و کلاسیکی زبانوں میں کتابیں دستیاب نہیں تھیں لیکن پورے ہندوستان میں اب بھی مدارس قائم تھے لیکن ان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی تعداد بہت مختصر تھی" اس طرح پہلی جنگ آزادی میں وہ تمام مدارس تباہ کر دیے گئے تھے جہاں سے مسلمانوں کی تعلیم ہوتی تھی۔

<u>مسلمانو میں تعلیمی تقسیم:-</u> انگریزوں کی آمد اور سیاسی استحکام کے بعد جب مغربی تہذیب ہندوستان میں پھلنے پھولنے لگی تو اس کا سب سے دردناک المیہ یہ رونما ہوا کہ مسلمانوں نے اپنی تعلیم گاہوں اور درسگاہوں کو اپنی مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کے تحفظ کی نیت سے اپنی مذہبی تعلیم کو صرف قرآن، منطق، فلسفہ اور حدیث و فقہ تک محدود کر لیا اور عوامی بغاوت کے سانحہ نے ہندوستان میں صدیوں سے قائم تعلیمی نظام کو درہم برہم کر دیا چنانچہ مسلمانوں کے اہل فکر و رائے

نے دینی اور اسلامی علوم کے تحفظ کی غرض سے مدارس کی شکل میں مضبوط قلعے بنوائے۔ دینی علوم کی اس قلعہ بندی سے دینی علوم تو محفوظ ہو گئے لیکن ایک عظیم نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں کے تعلیمی مدارس عصری علوم وفنون سے محروم ہو گئے جس سے تعلیم جیسی ہمہ گیر شے بھی دو فکری گروہوں میں تقسیم ہو گئی جو (۱) دینی تعلیم (۲) دنیاوی تعلیم کے نام سے ہندوستانی مسلمانوں میں آج بھی رائج ہے۔ تعلیم کی اس تقسیم نے مسلمانوں کو زبردست اور ناقابل تلافی نقصان پہونچایا اور آج جب دنیا اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے معراج ترقی تک پہونچ گئی ہے مسلم معاشرہ میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ عصری تعلیم کو حرام اور ناجائز سمجھتا ہے تو دوسرا طبقہ دینی تعلیم کو قدامت پسندی، دقیانوسیت اور از کار رفتہ ہونے کا تصور کرتا ہے مسلمانوں کی تعلیم کی اس غیر فطری تقسیم نے مسلمانوں کو تعلیمی اعتبار سے ڈھکیل کر پیچھے کر دیا ہے اور مسلم معاشرہ تعلیمی لحاظ سے عدمِ توازن کا شکار ہو کر رہ گیا ہے جس سے دن بدن مسلمانوں کی حالت زار خراب سے خراب ہوتی جارہی ہے کیونکہ تعلیم اور متحرک و فعال تعلیم ہی تمام طرح کی پس ماندگی کو دور کرنے کا بہترین آلہ ہوتی ہے۔

مسلمانوں کی تعلیمی تقسیم ایک طرف اسلام مخالف انگریز حکمرانوں کی تعلیمی پالیسی کا نتیجہ تھی تو دوسری طرف وقت وحالات اور تقاضات کے ردعمل اور مغرب کی اسلام دشمن مشرق مخالف رویوں کی دین کیونکہ مغرب نے اندلس، اسپین اور قرطبہ میں مسلمانوں کے مذہب وعقیدہ اور تہذیب وثقافت کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ ہندوستانی مسلمانوں کے علماء ودانشوران کے سامنے تھا۔ انگریز حکمرانوں اور عیسائی مبلغوں نے اسلام کے تئیں جو رویے اپنائے تھے اس کی وجہ تو سمجھ میں آتی تھی کہ انھوں نے چونکہ حکومت واقتدار مسلمانوں سے چھین رکھا ہے اس لئے وہ مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا سیاسی حریف اور دشمن تصور کرتے ہیں اور ان کی ساری پالیسی در پردہ ایسی ہوتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں پھر سے سیاسی طاقت نہ ابھر سکے لیکن یہی کام

اور ایسی پالیسی ہندوستانی تنظیموں جیسے آریہ سماج، شدھی سنگٹھن وغیرہ نے بھی اپنانا شروع کر دیا تھا تو مسلمانوں نے محسوس کیا کہ انگریزوں کی قدیم کلیسائی پالیسی لڑاؤ اور حکومت کرو کے تحت انگریز ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کو ہوا دے رہے ہیں لہٰذا انھوں نے اپنے مذہب اور عقائد وشریعت کے احیاء پر توجہ دی اور ایک طبقہ نے انگریزوں کی تمام تعلیمی پالیسیوں تعلیمی اداروں اور تعلیمی طور طریقوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے پورے طور پر اپنے مذہب وعقیدہ کے تحفظ اور بقا میں جٹ گیا۔

اسلام میں تعلیم کے تصور کی محدودیت نہیں ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے علم وفن کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ تعلیمی لامحدودیت کے نتیجہ کے طور پر ہی رونما ہوئے تھے۔ علم طب، ریاضی، جیومیٹری، الجبرا، طبیعات اور دیگر اسی طرح کے علوم جن کا تمام تر تعلق دنیاوی معاملات سے ہوتا ہے مسلمانوں نے ان علوم کو نہ صرف اپنایا بلکہ اس کے فروغ وارتقاء میں ایسے ایسے محیر العقول کارنامے انجام دیئے کہ آج بھی تاریخ کے صفحات متحیر ہیں۔ موجودہ عصری علوم کی بیشتر شاخوں اور سائنس وٹکنالوجی کی ترقی دراصل مسلم ماہرین کی ہی مرہون منت ہے۔ عمر خیام، البیرونی، غزالی، ابن رشد اور دیگر علمائے سلف کی کتابیں آج بھی ان جدید علوم کے حصول اور تحقیق وترقی میں رہنمائی کرتی ہیں۔

دینی ودنیاوی علوم کی تقسیم ہمیں قرون اولیٰ اور مسلمانوں کے عہد عروج میں کہیں نہیں نظر آتی اور ہر علم چاہے وہ عصری ہو یا دینی تعلیم کے ایک ہی تصور سے تعلق رکھتا تھا اور ماضی میں مسلمانوں کی جتنی بھی اعلیٰ اور ارفع درسگاہیں رہی ہیں ان میں کہیں بھی دینی اور دنیاوی علوم کی تخصیص نہیں پائی جاتی تھی اور تمام علوم ایک ہی نہج پر پڑھائے جاتے تھے چاہے وہ ریاضی کے فارمولے ہوں، تعمیر کے اصول ہوں یا فن خطاطی کے طور طریقے یا قرآن وسنت کی تفسیر اور سارے علوم اور مضامین کا رشتہ اسلام کے بنیادی عقائد سے جڑا ہوتا تھا۔ اور تمام مسلم اساتذہ

اسے بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے ذریعہ کے طور پر پڑھاتے تھے۔لیکن انیسویں صدی میں جب انگریزوں اور انکے بعض ایجنٹوں نے ایک منصوبہ بند سازش کے تحت تعلیم کو ہتھیار بنا کر اس ہتھیار سے اسلامی تہذیب وعقائد اور مذہب وشریعت کو ہی قتل کرنے کے منصوبہ کی عملی طور پر تکمیل میں لگ گئے تو ان کے تحفظ وبقا کے لئے ہنگامی طور پر اپنی تعلیم کو الگ کر کے اپنی مذہبی شناخت کی بقا کے لئے ضروری سمجھا گیا اس طرح ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی تقسیم بعض ناگزیر حالات کے سبب ہوئی پھر بھی یہ تعلیمی تقسیم غیر فطری تھی اور ملک کی آزادی کے بعد مسلم رہنماؤں کو اس بارے میں غور کرنا چاہیئے تھا۔

انیسویں صدی کے مذکورہ تعلیمی،تہذیبی اور سیاسی عہد وماحول میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور انکے رفقاء کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل ہوئی لہذا وہ اپنے دور کے عہد وماحول کے نمائندے بھی ہیں اور مصلح بھی اس لئے ان کے تعلیمی تصورات ونظریات کی تشکیل میں بھی انکے عہد وماحول کے اثرات نمایاں ہیں اور انھیں اثرات کی روشنی میں انھوں نے مستقبل کے حالات کا اندازہ کر کے اپنے تعلیمی تصورات ونظریات کی تشکیل کی ہے اور انکے سارے تعلیمی تصورات اپنے عہد وماحول کے عمل اور ردعمل کے نتیجہ میں وجود میں آئے ہیں لہذا ان کا صحیح جائزہ وتجزیہ مذکورہ عہد وماحول کے تناظر میں ہی کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

باب چہارم

تحریک دیوبند

☆ تحریک دیوبند کا پس منظر

☆ انگریز حکمرانوں کی اسلام دشمنی

☆ عیسائیت کی تبلیغ اور ثقافتی یلغار

☆ مناظرۂ فنڈر و کیرانوی

☆ تحریک ولی اللہی

☆ شاہ عبدالعزیز کے انقلابی کارنامے

☆ عوامی بغاوت

☆ تحریک دیوبند کا آغاز

☆ قیام دارالعلوم دیوبند

☆ تحریک قیام مدارس

☆ نظام تعلیم و تربیت

☆ نصاب تعلیم

☆ ماہر فن اساتذہ

☆ اخلاقی تربیت اور عوامی رابطے

تحریک دیوبند

نبی کریمؐ نے عرب میں جب تعلیم کا آغاز کیا تو مکہ میں چند گنتی کے لوگ ہی پڑھنا لکھنا جانتے تھے اور تقریباً یہی حال مدینہ منورہ کا بھی تھا۔ نبی کریمؐ خود امی تھے لیکن اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے جب نبوت مبعوث ہوئی تو آپ کو الہامی تعلیم بھی دی گئی اور آپ نے معلمی کی ذمہ داری نبھائی اور ایسا طریقہ اپنایا کہ چند سالوں کی معمولی سی مدت میں عرب کا لق ودق صحراء جہاں ہر وقت جہالت کی آندھیاں چلتی تھیں دیکھتے ہی دیکھتے علم کی شادابی سے لہلہانے لگا۔ ہر طرف سے علم و فضل کے دروازے کھل گئے۔ آپؐ نے اپنی نگرانی میں اسلام کی اولین درسگاہ کی بنیاد رکھی اصحاف صفہ کی تعلیم وتربیت کا مسجد نبوی میں نظم کیا جہاں بہت سے طلباء تعلیم حاصل کرنے لگے حضرت معاذ بن جبلؓ اس درسگاہ کے ناظم مالیات مقرر کیے گئے اور آپؐ کی نگرانی میں یہ عظیم بنیادی درسگاہ اسلام میں علم کے فروغ کا نمونہ بن گئی۔

نبی کریمؐ کے زمانے میں دارارقم، مسجد نبوی اور مسجد قبا سے تعلیم وتعلم کا جو سلسلہ شروع ہوا تو مسلمانوں کے علاقے جیسے جیسے وسیع ہوتے گئے یہ تعلیمی سلسلہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا یہاں تک کہ خلافت راشدہ خصوصاً حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت اس میں ہمہ جہت توسیع ہوئی۔ نصاب تعلیم اور معلمین پر خصوصی توجہ دی گئی اور ہر اس جگہ تعلیم وتعلم کا رواج ہوا جہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اور خلافت بنی عباسیہ کے عہد میں تو مسلمان دنیا کی سب سے تعلیم یافتہ اور مہذب قوم تسلیم کی جانے لگی۔ عرب، ایران اور ترکستان وغیرہ ممالک میں مسلمانوں کے تعلیمی سلسلے نے ایک ذہنی وفکری انقلاب برپا کر دیا اور جہاں کہیں بھی مساجد قائم ہوئیں ان میں تعلیم کا سلسلہ بھی قائم ہوگیا۔ دورِ صحابہ وتابعین میں مساجد میں عمومی تعلیمی حلقے اور مجالس قائم ہوگئیں جہاں قرآن، احادیث، فقہ، قضا، فتویٰ، تیراکی، تیراندازی، نشانہ بازی اور شہسواری وغیرہ کا

بہترین انتظام ہوتا تھا۔

۴۰۰ھ میں الحاکم بامراللہ نے سلطنت کی طرف سے پہلا مدرسہ قائم کیا۔ اس کے علاوہ مدرسہ بیہقیہ نیشاپور اور دیگر مدارس کا قیام عمل میں آیا۔ ۴۱۰ھ میں محمود غزنوی نے غزنی میں ایک شاندار مدرسہ قائم کیا۔ تمام اسلامی حلقوں میں تعلیم کی گرم بازاری شروع ہوگئی مگر تعلیم عموماً مسجدوں میں ہوتی رہی۔ ۴۵۶ھ میں عباسی خلفا کے سلجوقی وزیر اعظم نظام الملک طوسی نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ کی تعمیر شروع کی جس کی تکمیل ۴۵۹ھ میں ہوئی۔ اسی سال اس کا افتتاح ہوا۔ اس مدرسہ کے قیام سے مسلم حکمرانوں میں تعلیم کی توسیع واشاعت کا ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورے مشرقی عالم اسلام میں سلاطین، امراء، وزراء اور رؤساء نے اپنے اپنے علاقوں میں مساجد، خانقاہیں اور مدارس قائم کرنے شروع کر دیئے اور ان مساجد و مدارس میں علماء، فقہا اور محدثین ومشائخ جمع کئے اور ان کے لئے وظائف کے انتظامات کئے۔ خود نظام الملک طوسی نے بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے علاوہ بلخ، نیشاپور، ہرات، اصفہان، بصرہ، مرو، موصل، طبرستان اور عراق وخراسان ہر شہر وقصبہ میں مدارس کا قیام کیا اور سب کے سب مدرسہ نظامیہ کے ہی نام سے موسوم بھی کئے گئے۔ جس سے اسلامی دنیا میں تعلیم کو کافی فروغ حاصل ہوا اور ایسی تعلیمی فضا ہموار ہوئی کہ تعلیم وتدریس میں مسلمانوں کا کوئی ثانی وہمسر نہیں رہا اور مسلمان دنیا کی سب سے ترقی یافتہ، تعلیم یافتہ، مہذب ترین اور طاقتور قوم تسلیم کئے جانے لگے۔

دیوبند تحریک کا پس منظر:- ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی یہاں بھی تعلیم وتعلم کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہاں بھی علماء ومشائخ کی مجلسیں درس وتدریس میں مصروف ہوگئیں۔ غیاث الدین بلبن اور علاء الدین خلجی کے عہد حکومت یعنی ساتویں صدی ہجری مطابق چودھویں صدی عیسوی میں باقاعدہ تعلیم کا رواج شروع ہوا۔ شمس الدین التمش نے شہاب الدین غوری کے اصل نام معزالدین کے نام پر دہلی اور بدایوں میں مدرسہ معزی کے نام سے دو مدارس

قائم کیے۔ ۷۱۵ھ میں سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی نے مسجد قوت اسلام بنوائی جہاں آج بھی قطب مینار واقع ہے۔ مسجد کے اطراف میں حجروں کے کھنڈرات وہاں اپنے عہد میں عظیم الشان مدرسہ کے وجود کی گواہی دیتے ہیں۔ دہلی میں خرم آباد اور حوض خاص میں بھی مدرسے قائم تھے جن میں سب سے زیادہ شہرت فیروز شاہ کے بنوائے ہوئے مدرسہ فیروز شاہی کو حاصل ہوئی۔ یہ اپنے دور کا عظیم الشان جامعہ تھا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی عہد جہانگیری میں ایک مدرسہ کا تذکرہ کرتے ہیں جہاں انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے محبوب معتمد وحیدر آباد کے نواب آصف جاہ کے والد امیر غازی الدین نے بھی اجمیری دروازے کے قریب ایک نیا مدرسہ قائم کیا تھا جسے بعد میں انگریزی کمپنی نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ مدرسہ رحیمیہ جسے شاہ عبدالرحیم نے قائم کیا تھا اور جس کے آغوش علمی میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ عبدالعزیز، شاہ اسماعیل شہید اور شاہ اسحاق جیسے نابغۂ روزگار علماء وفقہا پلکر جوان ہوئے تھے اور جنھوں نے برصغیر ہندوپاک کے چپے چپے کو علم حدیث کے نور سے اس طرح منور کردیا تھا کہ اس کی روشنی عرب تک پہونچ گئی تھی اسی طرح لاہور، پنجاب، آگرہ، فتح پور سیکری، متھرا، بدایوں، رام پور، بریلی، پیلی بھیت، لکھنؤ، خیرآباد اور جونپور سمیت سارے شمالی ہندوستان میں عہد اسلامی میں مدارس قائم تھے اور جن کی اس دور میں کافی شہرت تھی اور جہاں دور دراز سے تشنگانِ علوم اپنی علمی پیاس بجھانے آتے تھے اور سیراب ہوتے تھے۔

گجرات، بنگال اور بہار کے علاوہ جنوبی ہندوستان میں برہان پور، بیجاپور، گلبرگہ، بیدر، احمد نگر اور مالوہ وغیرہ میں بھی کثرت سے مدارس موجود تھے۔ علامہ بحرالعلوم مولانا عبدالعلی کو دعوت دیکر نواب والا جاہ نے مدرسۂ اعظم قائم کیا تھا چنانچہ چودھویں صدی کے ایک مورخ شہاب الدین العمری کے بیان کے مطابق اس وقت صرف دلی میں ایک ہزار مدارس تھے اور چاروں

طرف سے علم کے متوالے آتے رہتے تھے اور علم و آگہی کی پیاس بجھاتے تھے۔ اسی طرح کپتان الکزنڈر ہملٹن نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ ''فقط شہر ٹھٹھ میں اور دارالسلطنت سے تقریباً ہزار میل سے زیادہ دوری پر واقع ہے مختلف علوم وفنون کے چارسو کالج موجود تھے۔'' اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسلم عہد میں تعلیم وتعلم کا کیا حال رہا ہوگا۔ جبکہ انگریزی دور حکومت میں جب اسکول وکالج کا خوب چرچا کیا گیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ انگریزی عملداری کے پورے علاقے میں ڈھائی سو سے زائد اسکول وکالج نہیں تھے۔

ہندوستان میں مسلم حکومت کے قیام سے برطانوی سامراج کے عہد تک مسلمانوں کے مدارس بکثرت موجود تھے جس کے ثبوت میں ولیم ایڈم (William Adam) کی تینوں اور ہارٹاگ رپورٹ پیش کی جاسکتی ہے۔ مسلم حکمرانوں، نوابین، وزراء، امراء، اور روسا نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں مساجد کے ساتھ مکاتب اور مدارس کا اہتمام کررکھا تھا۔ جاگیریں وقف کررکھی تھیں اور طلباء اور معلمین کی خدمت کے لئے وظائف اور دوسری سہولیات مہیا کی تھیں جس سے ہندوستان میں مسلمانوں اور دوسرے ہندوستانیوں کے لئے ہر طرح کی تعلیمی سہولیات میسر تھیں اور علوم وفنون کو فروغ حاصل تھا لیکن مغربی استعماریت سے جیسے جیسے مسلم حکومتوں کا زوال ہوتا گیا مدارس ختم ہوتے گئے یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ایک منصوبہ بند سازش کے تحت مسلمانوں کے سارے مکاتب اور مدارس تباہ وبرباد اور نیست ونابود کردیے گئے۔ جو نیا نظام تعلیم رائج کیا گیا اس میں مذہبی تعلیم کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی جس کا اعتراف خود انگریز مصنف ہنٹر (Hunter) نے درج ذیل الفاظ میں کیا ہے۔ ''ہمارے طریقہ تعلیم میں مسلمانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔''

انگریز حکمرانوں کی اسلام دشمنی:۔ مغربی دنیا نے صلیبی جنگوں سے یہ تجربہ کرلیا تھا کہ مسلمانوں کا شیرازہ خواہ کتنا ہی منتشر کیوں نہ ہو۔ اوران کے باہمی اختلاف خواہ کتنے ہی سنگین

ہوں لیکن جب ان پر کسی مشترک دشمن کی طرف سے جنگ مسلط کیجاتی ہے تو وہ متحد ہو جاتے ہیں اوران کی ایمانی غیرت وحمیت بھڑک اٹھتی ہے اور خدا کی راہ میں شہید ہو جانے کا شوق وجذبہ ان کے دلوں میں ایساموجزن ہو جاتا ہے کہ وہ سر سے کفن باندھ کر میدان جنگ میں بلاخوف وخطر کود پڑتے ہیں۔ ایسے میں پورا یوروپ بھی متحد ہو کران کی چھوٹی سی بھی کسی اسلامی جماعت کے پائے ثبات میں لرزش نہیں پیدا کرسکتا ہے۔

مسلمانوں کی اسی ایمانی قوت کو کمزور کرنے کے لئے اوران کے ایمانی سوتوں کو شک کرنے کے لئے عیسائی اور یہودی دانشوروں اور علماء نے سب سے پہلے مسلمانوں پر ثقافتی یلغار کا منصوبہ بنایا اوراسے پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے تعلیم کو بطور ڈھال کے استعمال کیا تاکہ نئے مغربی اقدار وروایات کا بیج بو کر انھیں انکے اسلاف کی روایات واقدار سے منقطع کر دیا جائے چنانچہ اسی مقصد کے تحت مغربی دنیا نے اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کا قیام کیا اور ایک منصوبہ بند سازش اور مخصوص نظام تعلیم وتربیت کے تحت ایسے درسی مواد جمع کیے تاکہ اس کے پڑھنے کے بعد مسلمانوں کی نئی نسل اپنی روشن وتابناک تاریخ اور شاندار ماضی سے ناآشنا اور بدگمان ہو جائے اور اسلامی تشخص کے بنیادی عناصر سے محروم ہو جائے اور نئی یورپی تہذیب کی گرویدہ ورسیا بنا کر تعلیم کے بعد انھیں مغربی سامراجی منصوبوں کے لئے استعمال کیا جاسکے جیسا کہ لارڈ میکالے نے کہا تھا کہ ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہوں مگر فکر و خیال کے لحاظ سے عیسائی ہوں۔''

اسلام اور مسلمانوں پر اس ثقافتی یلغار میں تمام مغربی ممالک برابر کے شریک تھے کیونکہ ایسا ہی ایک تجربہ وہ اس سے پہلے اندلس اور اسپین میں کر چکے تھے چنانچہ فرانس نے انیسویں صدی عیسوی میں اپنے غاصبانہ مقبوضات الجزائر، مالی، سینگال، لبنان، شام اور دیگر ملکوں میں بھی ایسی ہی پالیسی اختیار کر رکھی تھی جیسی کہ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنائی تھی۔

اس نے مصر کے اسکولوں، مدرسوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں اپنی زبان اور اپنی تہذیب رائج کر کے طلباء کے معصوم ذہنوں میں ان کی قومی اور ملی تہذیب کی تحقیر بیٹھادی تھی جیسا کہ لوئس ماسینون (Lues Massignon) نے کہا تھا کہ ''وہ مشرقی طلباء جو فرانس تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں ان کو عیسائی رنگ میں رنگنا ضروری ہے۔'' اسی طرح کرومر (Cromer) جو مصر میں انگلینڈ کا نمائندہ تھا اس نے مصر آنے پر کہا تھا کہ ''میں تین چیزیں مٹانے کے لئے آیا ہوں قرآن، کعبہ اور ازہر۔'' ہندوستان میں برطانیہ نے انگریزی زبان کو عام کر کے انگریزی کو علمی اور سرکاری زبان بنانے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی تھی جبکہ ہندوستان میں اس وقت فارسی اور اردو جیسی جدید اور وسیع زبانیں موجود تھیں اور سرکاری و علمی زبان کے طور پر رائج بھی تھیں۔

مذکورہ بالا تناظر میں یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مغربی دنیا مسلم نوجوانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے اور اپنی مغربی زبان و تہذیب سے آشنا کر کے مسلمانوں کی نئی نسل کو ذہنی طور پر اسلام اور اسلامی عقائد سے دور کر کے ان کے ذہن و دل سے اسلام اور اسلامی عقائد کے نقوش کو مٹا دینے پر تلی ہوئی تھی۔ انھیں ملکی اور عالمی حالات کے ادراک و عرفان کے سبب مسلمانوں میں اسلام کی صحیح روح اور اسپرٹ پیدا کرنے کے لئے بعض مذہبی علماء اور دانشور موجودہ عالمی حالات کے باعث کافی فکر مند تھے جن میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی اور دوسرے صاحب فکر و نظر شامل تھے۔

<u>عیسائیت کی تبلیغ اور ثقافتی یلغار</u>:- مغربی سامراج نے ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کی خاص ہمت افزائی کی۔ عیسائی مبلغین کو ہر طرح کی سرکاری سہولیات فراہم کی گئیں۔ مستشرقین کی کتابوں کی اشاعت کی گئی انھیں ہر طرح کے اختیارات و مراعات سے نوازا گیا تاکہ وہ مقامی عقائد اور قومی تہذیبوں کے خلاف اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔ اس کے علاوہ مسلم طلباء کی اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ کے تعلیمی اداروں میں داخلے کی سہولیات دی گئیں اگرچہ اعلیٰ تعلیم کا انکا یہ

تجربہ بعد کے حالات میں صحیح ثابت نہ ہوسکا کیونکہ بیشتر مسلم تعلیم یافتہ حضرات جنھوں نے یورپ جاکر تعلیم حاصل کی تھی وہ انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ میں پیش پیش رہے اور ہندوستان میں قومیت کے جذبات ابھارنے میں نمایاں کردار ادا کیا مثال کے طور پر علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

عیسائی مشنریوں سے مسلم ملکوں میں تعلیمی ادارے کھلوائے گئے تاکہ ابتدا سے ہی بچوں کی ذہن سازی کی جاسکے چنانچہ اس کی سب سے پہلی رائے دانیال بلیس (Daniyal Bliss) اور ڈاکٹر ولیم ٹامسن (Dr. Williaom Tomson) نے دی تھی جنھوں نے اسلامی ملکوں میں اسکول ومدارس کے قیام کے سلسلے میں غور کیا تھا تاکہ جو مسلمانوں میں عیسائی مبلغین تیار ہوسکیں اور بڑی تعداد میں لوگوں کو عیسائی مذہب کی طرف متوجہ کرسکیں چنانچہ اسی منصوبے کے تحت ترکی، شام، مصر، لبنان اور عراق میں اسکول کھولے گئے اور اونچے گھرانوں کے بچوں کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ انکا خیال تھا کہ مسلم اشرافیہ کے بچے ہی ان اسکولوں سے تیار کیے جائیں کیونکہ عموماً ملک کے حکمران اور رہنما انھیں مسلم اعلیٰ گھرانوں سے پیدا ہوتے ہیں۔

انگریزی دور حکومت میں مسلمانوں پر ثقافتی یلغار کافی تیز ہوچکی تھی عیسائی مشنریاں اور پادری ہندوستان کے چپے چپے میں موجود تھے اور اسلام کے خلاف زہر افشانی میں مصروف عمل تھے۔ مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوچکی تھی اور انگریزوں کا مکمل تسلط ہندوستان پر قائم ہوچکا تھا۔ عیسائی پادریوں اور مبلغوں کی پوری ٹیم ہندوستان میں دندناتی پھر رہی تھی اور سرکاری سرپرستی میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ اسلام اور دیگر ہندوستانی مذاہب کو برا بھلا کہتے نہیں تھکتی تھی۔ ہندوستانی میلوں ٹھیلوں میں جاکر مسلمانوں اور ہندوؤں اور ان کے مذاہب پر بے بنیاد الزام تراشی انکا روز کا معمول بن گیا تھا۔ بنگال میں قحط پڑا تو ہزاروں ہندو مسلم یتیم بچوں کو عیسائی بنادیا گیا اور مشن اسکول کھول کر باقاعدہ تبدیلی مذہب اور عیسائی بنانے کا کام انجام دیا جانے لگا۔ اس

کے علاوہ مختلف قسم کی لالچ دیکر غریب اور مفلوک الحال مسلمانوں اور ہندوؤں کو بھی عیسائی بنایا جانے لگا۔ عیسائی مشنریوں کے حوصلے سرکاری سرپرستی کے سبب اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ وہ کچھ بھی کر سکتے تھے اور انھیں کوئی ٹوکنے والا نہیں تھا۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر کا زمانہ تھا۔ ہندوستان سے مغلیہ حکومت کی شان وشوکت کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ بہادر شاہ کی حکومت قلعۂ معلی تک محدود ہو چکی تھی۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر روزانہ عصر اور مغرب کے درمیان ایک عیسائی پادری جس کا نام ڈاکٹر کارڈ فنڈر تھا۔ عیسائی مذہب کی خوبیاں بیان کرتا تھا اور اسلام کی بے بنیاد کمزوریوں اور خامیوں کو اجاگر کرنے میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا تھا جس سے چاروں طرف افراتفری مچی ہوئی تھی چنانچہ جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو مسلم علماء نے اس کا جواب دینے کا فیصلہ کیا۔

<u>مناظرۂ فنڈر و کیرانوی:-</u> ڈاکٹر کارڈ فنڈر پادری جو ایک جرمن مشنری تھا اور جسے روسی حکومت نے جارجیار کے قلعہ شوشا سے نکال دیا تھا۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں کا اچھا جانکار تھا۔ ہندوستان آیا اور انگریز حکمرانوں کی سرپرستی میں پوری دریدہ ذہنی اور شدت کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی شروع کر دی اور پیغمبر اسلام اور ازواج مطہرات پر طرح طرح کی بہتان تراشی کا سلسلہ شروع کیا جس سے مسلمان تو مسلمان انصاف پسند اور سنجیدہ غیر مسلم بھی اپنی نفرت کا اظہار کرنے لگے۔

پادری فنڈر جو اپنی چرب زبانی اور بے حیائی کے لئے مشہور تھا اس نے پورے ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کا ایسا بازار گرم کیا کہ ہندوستانی مسلمان اس کی اسلام دشمنی اور بے ہودہ باتوں سے تنگ آ گئے تو مولانا رحمت اللہ کیرانوی جو سلسلۂ ولی اللہی سے تعلق رکھتے تھے اور دہلی میں تعلیمی و تبلیغی خدمات انجام دیتے تھے جب ان سے رہا نہ گیا تو انھوں نے تحریری طور پر پادری فنڈر کو مناظرے کا چیلنج کر دیا اور تمام ابتدائی مرحلے طے ہو جانے کے بعد اکبر آباد (آگرہ) میں کئی روزہ مناظرے کا پروگرام طے ہو گیا اور ۱۱ر اپریل ۱۹۵۴ء مطابق ۱۲ر رجب ۱۲۷۰ھ سے مناظرہ

کی شروعات کی تاریخ متعین ہوگئی۔ یہ مناظرہ اپنی نوعیت کا حیرت انگیز مناظرہ تھا جس میں اسلام اور عیسائیت کی حقانیت کی وضاحت کے لئے فیصلہ کن انداز اپنایا گیا اور مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں میں بعض معزز حضرات کو جج اور منصف منتخب کیا گیا۔

اسلام اللہ کا بھیجا ہوا آخری دین ہے اور اللہ ہی اس کی حفاظت کرنے والا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی طرف سے اسلام کی حقانیت کے لئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی جو انگریزی سے بالکل ہی نابلد تھے مگر مرشد آباد کے ڈاکٹر وزیر آغاں خاں کی مدد سے میدان میں اتر گئے اور اپنی خداداد صلاحیت، بہترین ذہانت، حاضر جوابی اور تبحر علمی سے تین دنوں تک لگاتار اپنے دلائل وشواہد سے یہ ثابت کر کے لوگوں کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ موجودہ انجیل جس کی پادری فنڈر تبلیغ کر رہے ہیں وہ اصل انجیل نہیں ہے بلکہ تحریف شدہ ہے۔ انھوں نے اس بات کو ایسے انداز اور دلائل سے ثابت کیا کہ خود پادری فنڈر لوگوں سے بھرے ہوئے مجمع عام میں انجیل مقدس کی آٹھ تحریفات کو برمحل تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے اور ناکام ونامراد ہو کر رات کی تاریکی میں مع اپنے چیلوں کے بھاگ گئے چنانچہ جب چوتھے روز حسب معمول مناظرے کا وقت ہوا اور عوام وجج صاحبان تشریف فرما ہو گئے مگر پادری فنڈر کا کہیں دور دور تک پتہ نہ چل سکا تو جج اور منصف صاحبان جو طرفین سے حکم بنائے گئے تھے عیسائیت کے خلاف اور اسلام کے حق میں فیصلہ صادر فرما دیا۔

ہندوستان میں شکست کھانے کے بعد پادری فنڈر دیگر اسلامی ممالک میں اپنی اسلام مخالف تبلیغی مہم کا پرچار کرتے ہوئے ترکی پہونچ گیا اور وہاں کے علماء کو چیلنج پر چیلنج دینے لگا چنانچہ عبدالعزیز خاں ترکی کی خواہش اور صدر اعظم خیر الدین پاشا ٹونسی کی تحریک پر وہاں کے سلطان نے حجاز کے گورنر کو خبر بھیجی کہ کوئی ایسا عالم بھیجئے جو یہاں ایک پادری کا جواب دے سکے۔ اس زمانہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی ہجرت کر کے مکہ معظمہ پہونچ گئے تھے اور وہیں مقیم تھے چنانچہ

حجاز کے گورنر کے حکم پر مولانا موصوف قسطنطنیہ تشریف لیگئے ۔ وہاں جب پادری فنڈر کو یہ معلوم ہوا کہ مناظرہ کے لئے وہی ہندوستانی مولوی یہاں بھی آ گیا ہے تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ ترکی مسلمان اور سلطان سبھی حیرت زدہ تھے کہ آخر وہ کونسا ہندوستانی عالم ہے جس کا نام سنتے ہی فنڈر جیسا قادرالکلام پادری بھاگ کھڑا ہوا۔ مولانا کیرانوی نے بعد میں اکبرآباد (آگرہ) کا سارا واقعہ وہاں کے لوگوں کو بتا دیا۔

اس زمانے میں صرف عیسائی پادری اور انگریز حکمراں ہی مسلمانوں کے درپۂ آزار نہیں تھے بلکہ آریہ سماجی، سناتن دھرمی، اور شدھی سنگٹھن کے لوگ بھی انگریز حکمرانوں کے ایماء پر مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں کسی سے کم نہیں تھے۔ انگریزوں نے اپنی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کے تحت ان تنظیموں کو ہر طرح کی سہولیات دے رکھی تھیں اور اسلام و مسلمانوں پر ہر طرح کے حملے کئے اور کرائے جارہے تھے اور سب ملکر ہندوستان کو بھی اندلس و اسپین بنانے پر تلے ہوئے تھے تا کہ اندلس و اسپین کی طرح ہندوستان سے بھی اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نام و نشان ہی مٹا دیا جائے۔

<u>تحریک ولی اللہی</u>:- شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ دربار پر ایسے لوگوں کا قبضہ تھا جو ہر طرح کی اخلاقی اور روحانی توانائی سے عاری تھے۔ عام مسلمانوں کی مذہبی اور روحانی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ پورے ملک میں جاہلانہ رسوم اور بدعات عام ہو چکی تھیں۔ باطل عقائد اور توہم پرستی کا دور دورہ تھا۔ علماء کا طبقہ خود غرضی اور مفاد پرستی میں ملوث تھا۔ دینی شعائر اور اصل اسلامی عقائد ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ اسلامی علوم وفنون اور قرآن وحدیث کی تعلیمات قصۂ پارینہ بنتی جارہی تھیں اور یونانی عقلی علوم وفنون کو ہی سب کچھ سمجھ لیا گیا تھا۔ اصل اسلام اور اسکی اہمیت لوگوں کے دلوں سے غائب ہوتی جارہی تھی۔ ایسے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے نعرۂ حق بلند کیا او

رپوری ایمانی وروحانی طاقت اورانتہائی جوش وخروش سے ان بدعات اور غلط رسومات کے خلاف آواز اٹھائی۔ مسلمانوں کو متحد کرنے کی انقلابی کوشش کی اوراس زمانے کی سرکاری، علمی اور عوامی زبان فارسی میں قرآن کا ترجمہ کر کے قرآن کی تعلیم سے عام لوگوں کو آگاہ کرنے کا اولین انقلابی کارنامہ انجام دیا جس سے خودغرض علماء کا ایک بہت بڑا گروہ ان کا زبردست مخالف ہوگیا۔ ان کے قتل کر دینے کی سازش رچی گئی اور قریب تھا کہ وہ شہید کردیئے جاتے کہ ان کے بعض شاگردوں کو حالات کا اندازہ ہوگیا جس سے وہ قتل ہونے سے بچ گئے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ میں قرآن وحدیث کا درس دیا۔ ''حجتہ البالغہ'' اور تقلید واجتہاد پر زریں کتابیں تصنیف کیں۔ مسلمانوں میں موجود ذہنی، فکری اور عملی جمود کو توڑنے کی کوشش کی تاکہ ان کے اندر موجود اجتماعی، سیاسی اور مذہبی انحطاط کو ختم کیا جاسکے اور جہاد فکر وعمل پیدا کر کے صحیح اسلامی طریقے پر سوچنے سمجھنے پر لگایا جاسکے اور اسلام کی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ کا احساس دلاکر ان کے اندر عزت ووقار کی بحالی کا جذبہ پیدا کر کے احیائے اسلام اور تجدید ملت کے لئے تیار کیا جاسکے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں میں غلط اور غیر اسلامی رسم ورواج کو مٹا کر اسلامی نظام عدل ومساوات کا اجراء کیا جائے اور اس کے لئے ایک انقلابی جماعت تیار کی جائے اور ایسے رضا کار پیدا کئے جائیں جو خالص ملی جذبے اور روحانی قوت سے سرشار ہوکر اس اہم ترین منصوبے پر مصروف عمل ہوجائیں۔ کیونکہ اس زمانے میں پوری قوم قومی اور ملی جذبے سے یکسر عاری ہوچکی تھی۔ درباری امراء بےعمل اور بےکردار ہوچکے تھے۔ علماء خودغرض اور مفاد پرست ہوچکے تھے اور مختلف غلط قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر کے معصوم عوام کو بے وقوف بنا کر ٹھگنے میں لگے تھے۔ حکومت بچوں کا کھیل بن چکی تھی۔ حکمراں اپنے انگریز آقاؤں کے اشاروں پر تگنی کا ناچ ناچ رہے تھے۔ فوجی پیشہ ور بے راہ رو ہوچکے تھے۔ ظلم وزیادتی اپنے نقطۂ عروج پر تھی ان حالات میں آپ کی دوربیں

نگاہیں مسلمانوں کے مستقبل کے حالات کو دیکھ رہی تھیں اور آپ دلی طور پر بے چین تھے چنانچہ آپ نے ایک انقلابی منصوبے کی تشکیل کی اور ابھی اس کے ابتدائی خاکے ہی ترتیب دے پائے تھے کہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔

شاہ عبدالعزیز کے انقلابی کارنامے:- شاہ ولی اللہ کے انتقال کے بعد آپ کے فرزند شاہ عبدالعزیز نے پہلا کام یہ کیا کہ ہندوستان کی ایک حیثیت مقرر کرتے ہوئے اسے دارالحرب قرار دیا اور مجاہدین کی تیاری شروع کردی۔ انھیں اتفاق سے سید احمد جیسے صاحب صدق وشجاعت مل گئے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کے ایماء پر انھوں نے عملی بنیادوں پر ایک جماعت تشکیل دی جس کے روح رواں مولانا عبدالحئی (داماد شاہ عبدالعزیز) اور مولانا اسماعیل (برادرزادہ شاہ عبدالعزیز) تھے۔ ان حضرات نے مسلمانوں میں اصلاح احوال ورسوم کی زبردست تحریک شروع کی جن کے نتائج انتہائی شاندار نکلے۔ لیکن شاہ ولی اللہ کے انتقال کے بعد تقریباً پینتیس چالیس سالوں میں مسلمانوں کا سیاسی زوال اپنی آخری منزل پر پہونچ چکا تھا اور مسلم دشمن طاقتوں نے سارے اسلامی ہند کو تہ وبالا کر کے رکھ دیا تھا۔ برطانوی استعماریت کے پنجے ہندوستان میں پوری طرح گڑ چکے تھے اور اس سے نجات کے لئے ایک زبردست انقلابی اقدام کی ضرورت تھی چنانچہ سید احمد اور ان کے رفقا نے حالات کا انتہائی باریک بینی سے جائزہ لیا اور کافی غور وفکر کے بعد تجدید احیاء اسلام کا رخ جہاد کی طرف موڑ دیا اور مجاہدین کی ایک جماعت تیار کر کے صوبہ سرحد کو اپنی عملی تحریک کا مرکز بنا کر احیاء ملت ودین کی سعی شروع کردی۔ لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی کے دن ابھی بھی باقی تھے چنانچہ یہ تحریک اپنوں کی ناعاقبت اندیشی اور غیروں کی ریشہ دوانیوں کے سبب مئی ۱۸۳۱ء میں جنگ بالاکوٹ میں ناکام ہوگئی۔ سید احمد اور شاہ اسماعیل شہید کردیئے گئے اور مجاہدین کی یہ جماعت منتشر ہوکر رہ گئی۔

ولی اللہی تحریک کے بعض جاں نثاروں نے سیاسی میدان میں ناکامی کے باوجود اپنی احیاء

اسلام کی کوششوں میں لگے رہے اور مسلمانوں نے بھی اپنی تحریک کو آگے بڑھایا جو آگے چلکر عملی میدان میں بڑی کامیاب ہوئیں۔شاہ صاحب نے ناکامی کے باوجود حالات کا نئے سرے سے جائزہ لیا اور اپنی کوششوں سے ایک بہت بڑے طبقے کو علم حدیث کی روشنی سے منور کر کے برصغیر میں دینی علوم کی بیداری کی شروعات کی چنانچہ ان کے لائق فائق جانشینوں نے علوم وفنون کی نشرو اشاعت شروع کردی اور غیر منقسم ہندوستان میں احیائے اسلام کے لئے ایک نیا باب کھولنے کی راہ ہموار کی۔شاہ ولی اللّٰہی خانوادے کے ایک دوسرے چشم و چراغ شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی نے اپنے نانا جان شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے مسند درس وتدریس کو آباد کر کے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم نے جو دہلی میں بہت پہلے مسند درس بچھائی تھی مگر ۱۲۸۵ھ میں حالات سے مایوس ہوکر ہجرت کر گئے تھے۔لیکن آپ کے درس حدیث کا چرچا مجددی خاندان کے ایک بزرگ شاہ عبدالغنی نے قائم تھا جو خاندان ولی اللّٰہی کے ہی شاگرد رشید بھی تھے۔ان کے ہی علم وعمل کے چشمے سے ہندوستان سیراب ہوتا رہا لیکن حالات نے ان کے بھی قدم کو ہلا کر رکھ دیا اور ۱۲۷۶ھ میں آپ نے بھی ہجرت کی راہ اختیار کر لی تھی۔

یہ وہ دور تھا جب سارے عالم اسلام میں علم حدیث ضعف وانحطاط کا شکار ہو چکا تھا ایسے میں علم حدیث کی اشاعت وترویج بھی شاہ صاحب کا ایک زبردست علوم کی بیداری کے لئے انقلابی کارنامہ ہی تھا جس کا اعتراف مصر کے ایک جلیل القدر عالم سید رشید رضا نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ”ہمارے ہندوستانی علماء کی توجہ اس زمانے میں اگر علم حدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے علم حدیث ختم ہو چکا ہوتا کیونکہ مصر، شام، عراق اور حجاز میں دسویں صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری کے اوائل تک

یہ علم ضعف کی آخری منزل پر پہونچ گیا تھا۔"

مذکورہ بالا ولی اللہی تحریک کی ساری انقلابی اور تعلیمی سرگرمیوں سے انگریز اس قدر خائف ہوگئے تھے کہ وہ اسلام اور قرآن کو دنیا سے مٹا دینا چاہتے تھے چنانچہ برطانیہ کے وزیر اعظم گلیڈ اسٹون نے کہا تھا۔" جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہوسکتی۔" اس کے علاوہ ہنری ہرمنگٹن تھامسن نے ہی کہا تھا کہ" مسلمان ایسی گورنمنٹ جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہوسکتے اس لئے کہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔"

عوامی بغاوت:- غربت، افلاس، سماجی عدم مساوات اور سیاسی ومعاشی ابتری سے ہندوستانی کراہ رہے تھے اور انگریز حکمراں ہندوستان کو چراگاہ سمجھکر دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے۔ یہاں کی صنعت وحرفت کو اپنی غلط صنعتی پالیسیوں سے تباہ وبرباد کررہے تھے۔ یہاں کے خام مال کو زبردستی سستے داموں میں خرید کر ہندوستان کی منڈیوں میں پہونچا رہے تھے اور وہاں کا تیار شدہ مال مہنگے داموں پر ہندوستانیوں کو لینے پر مجبور کررہے تھے۔ دیسی ریاستوں کو ایک ایک کرکے ہڑپ رہے تھے۔ لاولد والیان ریاست کے گود لینے کے اختیارات سلب کردیے تھے۔ ہندوستانی فوجیوں کو گائے اور سور کی چربی لگے کارتوس کو منہ سے کھولنے کے لئے مجبور کردیا تھا۔ یہاں کی صنعت وحرفت اور تجارت کو تباہ وبرباد کردیا تھا۔ ہندوستانی بنکر اور زراعت پیشہ دونوں تباہ وبرباد ہوچکے تھے۔ انگریزی زبان انگریزی ثقافت اور تعلیم کو زبردستی ہندوستانیوں پر تھوپ دیا گیا۔ ہندوستانی زبان، تہذیب، تاریخ اور مذاہب کی برملا تذلیل کی جاتی تھی۔ اسلام اور ہندو مذہب سمیت ہندوستان کے تمام مذاہب اور ان کے ماننے والوں کی تحقیر کی جاتی تھی جس کے نتیجے کے طور پر ہندوستانی بنکروں، تاجروں، کسانوں، دیسی حکمرانوں اور فوجیوں میں نفرت کی آگ سلگتے سلگتے عوامی بغاوت کے روپ میں بھڑک اٹھی اور دیکھتے دیکھتے پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔

۱۸۵۷ء کے خونی حادثہ کے نتیجہ میں جب دہلی سمیت ہندوستان کے زیادہ تر مسلم تعلیمی مراکز تباہ وبرباد کردیے گئے۔ دلی کی علمی وتہذیبی مرکزیت ختم ہوگئی تو علم ودانش کا کارواں بھی رخت سفر باندھنے پر مجبور ہوگیا۔ جو لوگ انگریزوں کے خلاف مذکورہ عوامی بغاوت میں شریک ہوئے تھے یا عینی شاہد تھے انھوں نے ہندوستانیوں کی لاشوں کو خاک وخون میں تڑپتے دیکھا تھا اور جس طرح مسلمانوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا اس کی مثال کہیں بھی انسانی تاریخ میں ملنی مشکل ہے اس عوامی بغاوت اور پہلی جنگ آزادی میں کل تقریباً دولاکھ مسلمان شہید ہوئے تھے جس میں اکیاون ہزار مسلم علماء تھے اور ایک لاکھ پچاس ہزار عام مسلمان تھے جس میں شرفا اور روسا بھی شامل تھے۔ جنگ کے بعد انگریز لمبے کرتے اور داڑھی والوں سے اس قدر متنفر تھے کہ جہاں کہیں بھی ایسے لوگوں کو دیکھتے تھے پھانسی دیدیتے تھے چنانچہ ایڈورتا ٹمسر کے مطابق صرف دلی میں پانچ سو علماء کو پھانسی دی گئی تھی اور شمالی ہند خصوصاً مغربی اترپردیش دلی اور پنجاب تک کا کوئی ایسا درخت نہیں بچا تھا جس پر مسلمانوں کو پھانسی نہ دی گئی ہو۔

اس جنگ آزادی میں حاجی امداداللہ مہاجر مکی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے بہ نفس نفیس حصہ لیا تھا اور شاملی کے معرکے پر انگریزوں کے چھکے چھڑا دیے تھے مگر جب دلی پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور جنگ ناکام ہوگئی تو انھیں بھی حالات کا شکار ہونا پڑا۔ ان لوگوں کے نام بھی وارنٹ جاری ہوگیا اور گرفتار کنندہ کیلئے انعام وصلہ کا اعلان کیا گیا۔ حاجی امداداللہ مہاجر مکی چند ماہ انبالہ، جگری، پنج اور لاسہ موضعات میں چھپتے چھپاتے سندھ پہونچ گئے اور کراچی سے عرب ہجرت کر گئے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی رام پور سے گرفتار کرکے سہارنپور لائے گئے جہاں انھیں تین دنوں تک کال کوٹھری میں بند رکھا گیا اس کے بعد انھیں ننگی تلوار کے سائے میں پاپیادہ دیوبند ہوتے ہوئے مظفرنگر لے جایا گیا اور چھ ماہ تک اور قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے بیان کے مطابق نو ماہ تک قید میں رکھا گیا۔ مقدمہ چلتا رہا اور قریب تھا کہ

پھانسی کی سزا ہو جاتی مگر قدرت کو ابھی ان سے کام لینا تھا اس لئے کاغذی ثبوت نہ ملنے کے باعث جنوری ۱۸۶۰ء میں انھیں رہا کر دیا گیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی جو شاملی کے میدان میں ہندوستانیوں کے سپہ سالار تھے انتہائی بہادر اور نڈر واقع ہوئے تھے لہذا وہ وارنٹ کے باوجود کھلے بندوں پھرتے رہے اور جب کوئی پولس والا گرفتار کرنے آتا تو مولانا اس کو اپنی حکمت سے ایسا چکمہ دیتے کہ وہ مولانا سے مل کر بھی انھیں گرفتار نہیں کر پاتا۔ اہل خانہ اور ہمدردوں نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر انھیں جب روپوش ہونے پر مجبور کیا تو تین دن روپوش رہنے کے بعد چوتھے دن پھر کھلے طور پر پھرنے لگے لوگوں نے جب پھر اصرار کیا تو یہ کہہ کر روپوشی سے انکار کر دیا کہ تین دن سے زیادہ روپوش رہنا سنت سے ثابت نہیں ہے کیونکہ نبی کریمؐ۔۔۔ غار ثور میں تین دن تک ہی روپوش رہے۔

۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو دہلی کی جامع مسجد کے صحن میں مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ انگریز شہر کی گلیوں اور کوچوں میں پھیل گئے اور جہاں عورتوں، بچوں اور مردوں کو پایا قتل کر دیا۔ ہر طرف لاشوں سے گلیاں بھر گئیں۔ خون برسات کے پانی کی طرح بہنے لگا ستائیس ہزار عام مسلمان شہید کیے گئے۔ مہینوں تک مسلمانوں کا قتل ہوتا رہا اور معزز ہستیاں گرفتار ہوتی رہیں اور پھانسی پر چڑھتی رہیں۔ خود مغلیہ سلطنت کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر کو معزول کر کے رنگون جلاوطن کر دیا گیا۔ ان کے جگر گوشوں اور اہل خاندان کو انتہائی سفاکی سے گولیوں سے بھون کر ابدی نیند سلا دیا گیا چنانچہ سر ولیم میور(Sir William Myure) نے اپنی کتاب ''اسباب بغاوت'' میں بعض خفیہ دستاویزوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۷ء کی صبح کو چوبیس شہزادوں کو دہلی میں تختۂ دار پر لٹکایا گیا جس میں بادشاہ کے داماد، برادر نسبتی، بھانجے اور بھتیجے شامل تھے۔ جھجر، بلب گڑھ، فرخ نگر اور فرخ آباد کے روساء نے بھی اس جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا چنانچہ ان میں سے بھی زیادہ تر لوگوں کو سولی پر لٹکا

دیا گیا اور بعض کو عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہوتے ہی ملک میں عیسائی مبلغین اور پادری برساتی مینڈھکوں کی طرح گلی کوچوں اور بازاروں میں ٹرٹرانے لگے اور مسلمانوں کے مذہب اور انکے دین وعقائد پر نازیبا حملے کرنے لگے اس سے قبل پادری اے۔ ریڈمنڈ (A. Redmend) نے کلکتہ سے عام لوگوں خصوصاً سرکاری ملازموں کو مراسلہ کے ذریعہ تنبیہہ کرنا شروع کردیا تھا کہ "اب تمام ہندوستان میں ایک عمل داری ہوگئی ہے ریلوے سے سب جگہ کی آمد ایک ہوگئی ہے اس لئے آپ کو بھی ایک مذہب میں داخل ہوجانا چاہیئے۔" ہندوستان کے سپریم کونسل کے باوقار رکن سر چارلس ٹریلیون جو حکومت کی طرف سے گورنری کے بلند عہدے پر فائز تھا پورے وثوق سے یہ کہتے نہیں تھکتا تھا کہ میرا یقین ہے کہ "جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہوگئے تھے اسی طرح یہاں (ہندوستان میں) بھی لوگ ایک ساتھ عیسائی ہوجائیں گے ملک میں مذہب عیسوی کی تعلیم بلاواسطہ کتابوں، اخباروں اور یورپیوں سے بات چیت وغیرہ کے ذریعہ نفوذ کرے گی حتیٰ عیسوی علوم سوسائٹی میں اثر کرجائیں گے تب ہزاروں کی تعداد میں عیسائی ہوا کریں گے۔"

برطانوی پارلیامنٹ کے رکن مسٹر منگلیس نے ۱۸۵۷ء کے آغاز میں برطانوی پارلیامنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "خدا تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیرنگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیئے اور اس میں کسی قسم کی تساہلی نہیں کرنی چاہیئے۔"

۱۸۶۲ء میں انگلستان کے وزیراعظم لارڈ یامرسٹن (Lard Yamereston) اور عذیرِ ہند چارلس ووڈ (Charless Wood) سے ایک وفد نے ملاقات کی وفد کا سربراہ

بشپ آف کنٹربری تھا وفد نے ہندوستان میں مشنری سرگرمیوں کی طرف توجہ دلائی اور چارلس ووڈ نے کہا کہ ''میرا ایمان ہے کہ وہ نیا عیسائی جو ہندوستان میں عیسائیت قبول کرتا ہے وہ انگلستان سے نئے رابطے کا باعث بنتا ہے اور حکومت کے استحکام کا ذریعہ ہے۔'' وزیر اعظم لارڈ پامرسٹن نے اس موقع پر فرمایا تھا کہ ''میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب اپنے مقصد میں متحد ہیں یہ ہمارا فرض ہی نہیں بلکہ خود ہمارا مفاد بھی اس عمل سے وابستہ ہے کہ ہم عیسائیت کو کونے کونے تک پھیلا دیں۔'' (دی مشن صفحہ نمبر ۲۴۴) لارڈ لارنس وائسرائے ہند (۱۸۶۴-۱۸۶۶) نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ''کوئی چیز بھی ہماری سلطنت کے استحکام کا اس سے بڑھ کر سبب نہیں ہوسکتی کہ ہم عیسائیت کو ہندوستان میں پھیلا دیں۔'' چنانچہ انگریز آفیسران اپنے ملازمین کو باقاعدہ حکم دیتے تھے کہ ''ہماری کوٹھی پر آکر پادری کے وعظ سنا کرو۔'' اور ایسا ہوتا بھی تھا۔

تحریک دیوبند کا آغاز:- ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں مسلمان بالکل تباہ و برباد کردیئے گئے اہل علم، صاحب ثروت، امراء، روساء اور تجارت پیشہ غرض کہ سبھی زبوں حالی کا شکار ہوگئے بیشتر لوگ قتل کردیئے گئے باقی یا تو ہجرت کرگئے یا جلا وطن کردیئے گئے، باعزت ذلیل وخوار ہوگئے باعزت ذلیل وخوار ہوگئے، خیرات وانعامات بانٹنے والے خود نانِ شبینہ کے لئے محتاج ہوگئے جو بچ گئے ان میں زندگی کی رمق تک باقی نہ رہی۔ مایوسی، محرومی اور عدم تحفظ کے احساس نے ان سے جینے کے احساسات تک چھین لئے اور چاروں طرف سکتہ کا عالم طاری ہوگیا کیونکہ یہ شکست صرف سیاسی نہیں تھی بلکہ یہ فکری، تہذیبی، تعلیمی اور معاشی بھی تھیں جس نے انسانی احساسات پر بھی کافی ضرب لگائی۔ لوگوں کے اوسان خطا ہوگئے اور مسلمانوں پر موت کا سناٹا طاری ہوگیا۔

مذکورہ مایوس کن حالات میں تحریک ولی اللہی سے متاثر اور مولوی مملوک علی استاد (دہلی کالج) کے دو شاگرد رشید مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خاں اٹھے اور انھوں نے اس مایوس

اور شکست خوردہ قوم میں زندگی کی رمق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی جنھوں نے اس پہلی جنگ آزادی میں شاملی کے محاذ پر ہندوستان کی کمان سنبھالی تھی اور جنگ بالاکوٹ کے انجام سے بخوبی واقف تھے مسلمانوں کی سیاسی غلامی کے باوجود انھیں ذہنی اور فکری غلامی سے بچانے کی تدبیر میں لگ گئے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ سیاسی غلامی سے کہیں زیادہ خطرناک ذہنی اور فکری غلامی ہوتی ہے چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کو ان کی تہذیب وثقافت، ماضی اور مذہب سے جوڑ کر ان میں نئی حرکی قوت پیدا کرنے کے لئے مذہبی تعلیم کے احیاء کو ضروری سمجھتے ہوئے دیوبند تحریک کا آغاز کیا۔ جبکہ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو سب سے پہلے معاشی پستی سے نکالنے کے لئے انگریزوں کی لائی ہوئی عصری تعلیم کے حصول کو ضروری سمجھا ان کا خیال تھا کہ معاشی پستی سے نکلنے کے ساتھ ہی جدید عصری تعلیم انھیں دوبارہ سربلندی عطاء کرنے میں کامیاب کرے گی چنانچہ انھوں نے علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا واضح ہو کہ سرسید احمد خاں نے بھی ۱۸۳۱ء کی جنگ بالاکوٹ دیکھی تھی اور ۱۸۵۷ء کے خونی حادثے کے بھی وہ چشم دید گواہ تھے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خاں دونوں ہی انیسویں صدی کے سب سے بڑے نبض شناس اور باریک بیں حضرات تھے اور انھیں اپنے دور کے حالات کا بخوبی ادراک تھا ساتھ ہی مستقبل کا بھی انھیں بخوبی اندازہ تھا دونوں کی نگاہ دوررس اور دونوں ہی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے معاملے میں پاک باطن اور مخلص تھے۔ اور شاید دونوں کی باتیں اسی انداز سے قوم نے تسلیم کرلی ہوتیں جیسا کہ یہ دونوں بزرگ چاہتے تھے تو ہندوستانی مسلمان نہ تعلیمی اعتبار سے پچھڑتے، نہ سرکاری ملازمتوں میں انکا تناسب کم ہوتا اور نہ ہی مسلمانوں کا تعلیمی توازن ہی بگڑ پاتا مگر حقیقت یہ ہے کہ قوم نے دونوں میں سے کسی کی بھی بات اس شدت اور جذبے کے ساتھ تسلیم نہیں کی جیسا کہ وہ چاہتے تھے یہاں اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ نہ تو سرسید احمد خاں مذہبی اور دینی تعلیم کے مخالف تھے اور نہ ہی مولانا قاسم نانوتوی انگریزی اور جدید انگریزی

تعلیم کے دشمن تھے لہٰذا اگر مسلمانوں نے دونوں کی بات کو دل سے مانتے ہوئے اگر تعلیم کے حصول میں دلچسپی لی ہوتی تو آج مسلمان علم جدید اور علم مذہب وعقیدہ دونوں اعتبار سے تعلیم میں آگے رہتے اور تعلیمی ترقی کی بدولت زندگی کے ہر میدان میں سربلند وسرخرو رہتے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی جس دور سے تعلق رکھتے تھے وہ اسلام دشمنی کا شدید ترین دور تھا اس سے قبل ہندوستانی مسلمانوں پر کبھی بھی ایسا شدید ترین دور نہیں آیا تھا کہ ایک طرف مسلمان آپسی فرقہ بندیوں میں گرفتار تھے۔ غلط اور غیر اسلامی رسم ورواج اور شرک وبدعات میں مبتلا تھے، غربت وافلاس اور ذہنی، فکری اور تعلیمی کم مائیگی کا شکار تھے تو دوسری طرف حکومت وقت، عیسائی مشنریاں، آریہ سماجی اور سناتن دھرمی وغیرہ ہندوستان سے مسلمانوں اور اسلام کا نام ونشان تک مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے اور قریب تھا کہ صدیوں میں تشکیل شدہ ہنداسلامی تہذیب اور مشترکہ گنگا جمنی کلچر کا ہی خاتمہ ہو جاتا کیونکہ مناظروں، مذاکروں اور مقابلوں کا بازار گرم تھا اور اسلام پر چوطرفہ حملے ہو رہے تھے چنانچہ ایسے حالات میں اسلام کی برتری برقرار رکھنے کے لئے اسلامی علوم وفنون کا احیاء اور انکی اشاعت کے ساتھ ساتھ ایک ایسے ''علم کلام'' کی بھی ضرورت تھی جو ان حالات میں مقابلے کی بھرپور توانائی سے پُر ہو کیونکہ اس سے پہلے جو ''علم کلام'' تھا وہ قدیم یونانی منطق وفلسفہ کے معترضین کے لئے تو کافی تھا لیکن آنے والے وقت میں جن مخالف طاقتوں سے پالا پڑنے والا تھا وہ کافی مختلف تھیں چنانچہ اس کے لئے مولانا نے جدید علم کلام کو اہمیت دی جس میں منطق وفلسفہ کے ساتھ انسانی نفسیات اور فطرت پسندی کو بھی بڑا دخل تھا۔

وجود باری، ذات باری اور صفات باری کے بارے میں قدیم علم کلام میں جتنی بھی موشگافیاں کی تھیں وہ نئے حالات وماحول میں پوری طرح ساتھ نہیں دے پا رہے تھے کیونکہ وجود باری، صفات باری اور وحدانیت کو اب عقلی اور مشاہداتی دلائل سے بھی ثابت کرنے کی

ضرورت پڑنے لگی اور مادہ کی قدامت کے خلاف عقلی اور تجرباتی دلائل درکار تھے کیونکہ نئے حالات میں تثلیثیت اور بے شمار دیوی دیوتاؤں اور اوتاروں کی حقیقت کو مشاہدات وتجربات اور انسانی عقل کی سائنٹفک کسوٹی پر پرکھ کران کھوٹے سکوں کو کھوٹا ثابت کر کے بھی دکھانا ہوتا تھا چنانچہ آپ نے اِن حالات میں جو کچھ بھی کیا وہ شاہجہاں پور کے ''میلہ خدا شناسی'' اوراس میں کی گئی مدلل اور لاجواب تقریروں سے ظاہر ہے جس میں مولانا نانوتوی کی فہم وفراست، ذہانت وفطانت، راستے کی تمام تر پیچیدگیوں کے باوجود انھیں پیش قدمی کرنے میں معاونت کرتی ہے اور معترضین کے اعتراضات بھی انھیں خاموش نہیں کر پاتے ہیں کیونکہ ایسے میں انکا علم کلام ایسے جوابات دیتا ہے کہ بھرے مجمعے میں معترضین نے اسلام کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ وہ جو کچھ بھی کہتے تھے روزمرہ کی زبان میں کہتے تھے تاکہ مخاطب اور تماشابین دونوں ہی ان کے نفس مضمون کو بخوبی سمجھ سکیں اور ایسے میں ان کا انداز بیان صاف اور سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ برجستہ پرکشش اور موثر ہو جاتا تھا جس سے وہ اسلام مخالفین کے سیلاب پر بندھ باندھنے میں کامیاب ہو جاتے تھے ان کی کتاب ''آب حیات'' اور ''ترکی بہ ترکی'' کے مطالعہ سے بھی بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مذکورہ حالات میں ایک ایسی تعلیمی تحریک کی ضرورت تھی جو نسل درنسل ایسے صاحب علم اور علماء پیدا کر سکے جو قرآن واحادیث اور فقہ کے ساتھ ساتھ علم کلام میں بھی درک رکھتے ہوں اور ایسے علماء کی ملکی پیمانے پر ٹیم تیار کرنے کے لئے کسی ایک مدرسہ یا درسگاہ سے کام چلنے والا نہیں تھا بلکہ اس کے لئے ایک ایسی تحریک کی ضرورت تھی جس کے تحت پورے ملک میں دینی مدارس کا قیام ہو سکے تاکہ ہندوستان بھر میں بے سہارا مسلمانوں اور ان کے مذہب وعقائد اور تہذیب وثقافت کی حفاظت ہو سکے اوران مدارس سے دین ومذہب اور قرآن واحادیث کی تعلیم کے ساتھ ایسی نسل بھی تیار ہو سکے جو انگریز مخالف عوامی بیداری پیدا کرنے کے علاوہ اندرونی اور بیرونی

اسلام مخالف طاقتوں کا مقابلہ بھی کر سکے تا کہ ہندوستان کو اندلس و اسپین بنانے کے اسلام دشمن طاقتوں کے منصوبوں کو ناکام کیا جا سکے۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کھو جانے کے بعد بھی ان میں اسلامی، اخلاقی اور روحانی تعلیم کو باقی رکھ سکے اور ہندوستان میں رضا کارانہ، داعیانہ اور قائدانہ جذبات کو پروان چڑھا کر حکومت وقت کی امداد و اعانت اور سرپرستی کے بغیر اپنے بل بوتے پر اپنے دینی تعلیم کے منصوبے کو نسلاً بعد نسلاً قائم رکھنے میں کامیابی مل سکے۔ چنانچہ اسی عظیم مقصد کے تحت دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس کو مرکز و نمونہ بنا کر اسی نہج پر پورے ملک میں مدارس کے قیام کی تحریک کو فروغ دیا گیا تھا۔

قیام دارالعلوم دیوبند:- ۱۵ رصفر ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ رمئی ۱۸۶۶ء بروز پنجشنبہ دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد جو چھتہ مسجد کے نام سے مشہور تھی اور جس میں ایک انار کا درخت تھا اسی درخت کے نیچے ایک استاد اور ایک طالب علم جو تاریخ میں ''دو محمودوں'' کے نام سے مشہور ہیں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی تھی جس کے پہلے استاد ملا محمود اور پہلے طالب علم محمود حسن تھے جو آگے چل کر شیخ الہند کے نام سے مشہور ہوئے اور جنہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں زبردست کردار ادا کیا۔ دارالعلوم جب دیوبند کی مسجد میں قائم کیا گیا اس وقت مولانا قاسم نانوتوی میرٹھ میں تصحیح کتب کے کام میں مصروف تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مستقبل کے دارالعلوم کا ذہنی خاکہ انھیں کا مرتب کردہ تھا۔ دارالعلوم کے قیام کے وقت حاجی سید عابد حسین، مولانا ذوالفقار علی، مولانا مہتاب علی اور منشی فضل حق موجود تھے اور سب سے پہلے سید عابد حسین نے اپنی جیب سے پانچ روپے نکال کر رقم کی فراہمی کی شروعات کی اور پھر اسی طرح بقیہ لوگوں نے بھی اپنی اپنی جیبوں سے پیسہ نکال کر جمع کرنا شروع کیا جس سے کل تین سو روپے جمع ہو گئے اس کے بعد یہ غور کیا گیا کہ مدرسہ کا قیام کیسے کیا جائے اور کسے مدرس رکھا جائے چنانچہ سید عابد حسین نے مولانا محمد قاسم نانوتوی کو مدرسی کے لئے خط لکھا کیونکہ مدرسہ کی بنیادی سوچ مولانا

موصوف کی ہی تھی۔

''کل عصر اور مغرب کے درمیان تین سو روپے جمع ہو گئے
آپ تشریف لے آئیں۔''

مولانا نانوتوی نے خط پا کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے
جواب میں تحریر فرمایا کہ ''میں بہت خوش ہوا خدا بہتر کرے۔
ملا محمود کو پندرہ روپے ماہوار پر مقرر کر کے بھیج رہا ہوں۔ وہ
پڑھائیں گے اور میں مدرسہ کے حق میں مساعی رہوں گا۔''

مذکورہ خط و کتابت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مدرسہ کا بنیادی منصوبہ مولانا کے ہی ذہن کی پیداوار تھا تبھی تو سید عابد حسین نے روپے جمع ہوتے ہی سب سے پہلے انھیں خط لکھا۔ اور انھیں دیوبند آنے کی دعوت دی لیکن اپنی مصروفیات کے سبب وہ دیوبند نہ آ کر ملا محمود کو پندرہ روپے ماہوار کے مشاہرہ پر مدرس مقرر کر کے یہ تحریر کیا کہ

''وہ پڑھائیں گے اور میں مدرسہ کے حق میں مساعی
رہونگا۔''

چنانچہ مولانا موصوف کا دیوبند میں قیام قیام دارالعلوم کے کئی سال بعد ۱۲۹۰ھ کو ہوا۔ اور دارالعلوم کا جو انھوں نے ذہنی منصوبہ ترتیب دیا تھا اسکو عملی شکل دینے کی با قاعدہ شروعات انھوں نے اپنے قیام دیوبند کے بعد کی تھی۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کو ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ اسمیں بنارس، پنجاب اور افغانستان تک کے طلبہ تعلیم کے لئے آنے لگے اور مدرسہ تنگ پڑنے لگا تو مولانا یعقوب نانوتوی کو پہلے ہی سال کے آخر میں صدر مدرس بنا دیا گیا اور چند ہی برس میں جب چھتہ مسجد ناکافی ہونے لگی تو مدرسہ کو جامع مسجد میں منتقل کر دیا گیا مگر اس کی روز افزوں ترقی سے جب یہ جگہ بھی

ناکافی ہوگئی تو مولانا نانوتوی نے اپنے ذہنی منصوبے کے مطابق آبادی سے باہر ایک کشادہ زمین تجویز کی اور اس کے لئے عملی کوششیں شروع کردیں۔ چندہ کی فراہمی کا کام شروع کیا جانے لگا اور ۲۰/ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۶ء بروز جمعہ تقسیم انعام کے بعد دارالعلوم دیوبند کی موجودہ عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ سنگ بنیاد کی اس تقریب میں مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی سید عابد حسین اور مولانا مظہر خاں دہلوی وغیرہ بطور خاص شامل تھے۔ حاجی سید عابد حسین اس نئی عمارت کے حق میں نہیں تھے ان کا خیال تھا کہ مدرسہ جس انداز سے جامع مسجد میں چل رہا ہے ویسے ہی چلتا رہے مگر مولانا نانوتوی نے انھیں راضی کرلیا اور سنگ بنیاد کی تقریب انکی شمولیت کے بعد ہی انجام پذیر ہوئی اور مولانا موصوف کے وسیع ذہنی خاکے کے مطابق اگلے سال سے باقاعدہ تعمیر کا کام شروع ہوگیا اور حاجی سید عابد حسین کو ہی مدرسہ کا پہلا متولی اور مہتمم منتخب کیا گیا۔

تحریک قیام مدارس:۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی دارالعلوم دیوبند کے اصل بانی نہیں ہیں۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جس مدرسہ کا قیام دیوبند کی چھتہ مسجد میں ہوا تھا اس وقت مولانا نانوتوی دیوبند میں موجود نہیں تھے وہ دیوبند مذکورہ مدرسہ کے قیام کے کئی سال بعد آکر دیوبند میں مقیم ہوئے مگر مدرسہ کے قیام کا اولین ذہنی خاکہ مولانا کا ہی مرتب کردہ ہے لہٰذا دارالعلوم دیوبند کے رسمی بانی مولانا نانوتوی ہوں یا نہ ہوں مگر فکری بانی ضرور ہیں اور تحریک دیوبند کے تو اصلی بانی آپ ہی ہیں کیونکہ مدرسہ کا وسیع ترین خاکہ اور منصوبہ بندی اور ذہن سازی میں آپ کا ہی بنیادی کردار رہا ہے لہٰذا دارالعلوم دیوبند اور تحریک دیوبند کے ذہنی اور فکری روح رواں دراصل مولانا قاسم نانوتوی ہی ہیں اور انھوں نے ہی اپنی وسیع تحریک کے اولین مقصد کے تحت دارالعلوم دیوبند کو مقصد بنا کر ہندوستان میں قیام مدارس کی تحریک کو عملی اور فکری توانائی عطا کی تھی۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے پہلے دس سالوں کے اندر ہی ہندوستان کے مختلف شہروں، قصبوں اورعلاقوں میں مدارس قائم کیے جانے لگے۔ مدارس کے قیام کی تقریب میں کہیں مولانا خودتشریف لے جاتے کہیں اپنے رفقاء کو بھیج دیتے اور کہیں مقامی لوگ ہی اس تحریک سے متاثر ہوکر مدرسہ قائم کرتے اور متوسطات تک کی تعلیم کا بندوبست کر کے اسے دارالعلوم دیوبند سے ملحق کردیتے تھے۔ اس طرح دارالعلوم دیوبند کو پورے برصغیر میں ایک دینی مرکزی درسگاہ کی حیثیت حاصل ہوگئی اور پورے ہندوستان میں قیام مدارس کے ساتھ ہی مذہب اسلام اور کتاب وسنت کے احیاء کی تحریک کو عملی فروغ ملنے لگا تھا، جگہ جگہ مدارس کا قیام ہونے لگا تھا، مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ شاہی مرادآباد، جامع مسجد امروہہ کا مدرسہ اور نگینہ بجنور کا مدرسہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے مولانا نانوتوی کے منصوبے اور تحریک کے زیراثر قائم ہوئے۔اترپردیش کے بالکل مشرقی اضلاع جیسے بنارس، غازیپور، اعظم گڑھ وغیرہ میں بھی مدارس قائم ہوئے۔ مئوناتھ بھنجن میں مولانا سلطان احمد نے دارالعلوم دیوبند کے طرز پر دارالعلوم مئو قائم کیا تو مولانا امام الدین پنجابیؒ نے شہزادی جہاں آرا کی قائم کردہ جامع مسجد شاہی کٹرہ میں مفتاح العلوم کا قیام کیا اس کے بعد پورے برصغیر ہندوپاک میں قیام مدارس کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک کسی نہ کسی شکل میں برقرار ہے۔

موجودہ دارالعلوم دیوبند کا سنگ بنیاد اگرچہ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں رکھا گیا تھا مگر مدرسہ کی تعمیر کا باقاعدہ کام ایک سال بعد ۱۲۹۳ھ میں شروع ہوا اور پانچ سال میں یہ عمارت نودرہ کے نام سے بن کر تیار ہوگئی۔ اس کے دو درجے ہیں اور ہر درجے میں نو نو دروازے ہیں اس لئے اس کا نام نودرہ پڑ گیا۔ اس کے نقشے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس زمانے کے مہتمم مولانا رفیع الدین صاحب کو اس کا الہام ہوا تھا۔ لیکن جن لوگوں نے مدرسہ دارالعلوم دیوبند کی عمارت کو غور سے دیکھا ہے اور ہندوستان کی قدیم ترین یونیورسٹی نالندہ کے کھنڈرات کا بھی باریک بینی سے

مشاہدہ کیا ہے انھیں یہ محسوس کرنے میں شاید دیر نہیں لگی ہوگی کہ نالندہ کے قدیم ترین تعلیمی مرکز کے کھنڈرات جو میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں اور جن میں ہندوستان کی عظیم ترین روحانی تعلیمی مرکز کی عمارت دفن تھی اور جس میں اصل شکل کھدائی کے بعد سامنے آئی ہے اس میں اور دارالعلوم دیوبند میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے اس کے دروازے اور اندورن میں جو دارالطلبہ (छात्र कक्ष) کے مختلف قطعات بنے ہوئے ہیں انھیں دیکھنے سے ایسا لگتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ہی ہیں اور کسی نے نالندہ کی اس قدیم ترین جامعہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسی نقش پر دارالعلوم دیوبند کی تعمیر کرادی ہے اور جن سرخ پتھروں کی موٹی موٹی اینٹوں سے نالندہ کی یہ قدیم عمارت تعمیر ہوئی تھی اسی طرح کی سرخ موٹی موٹی اینٹوں سے دارالعلوم دیوبند کی بھی تعمیر ہوئی ہے۔ جب کہ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں نالندہ یونیورسٹی کی تعمیر ہوئی تھی اس زمانہ میں نہ تو موٹی موٹی سرخ پتھر کی اینٹوں کا رواج تھا اور نہ ہی عموماً اس انداز کی تعمیر ہوتی تھی بلکہ اس زمانہ میں پتلی پتلی اور چھوٹی چھوٹی اینٹوں کا عام رواج تھا۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ نالندہ کی اس قدیم ترین تعلیمی درسگاہ میں کھدائی میں جو مٹی کے لوٹوں کا ذخیرہ ملا ہے وہ ٹونٹی والے بدھنے جو ابھی چند دہے پہلے تک مسجدوں میں عموماً وضو کے لئے استعمال ہوتے تھے اور انھیں خالص مسلمانی لوٹا یا بدھنا تصور کیا جاتا تھا کیونکہ اس قسم کا لوٹا آج بھی غیر مسلموں میں رائج نہیں ہے۔ یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ نالندہ کی کھدائی دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بہت بعد بیسویں صدی میں ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام نے ہندوستان میں روحانی اور اخلاقی تعلیم کو تاریخ نے دہرایا ہے۔ نالندہ یونیورسٹی اپنے زمانے کی عظیم الشان تعلیمی اور روحانی درسگاہ تھی اور جس نے ایک عالم کو اپنی تعلیمی اور روحانی روشنی سے منور کیا تھا اور دارالعلوم دیوبند کی بھی تعلیمی اور روحانی حیثیت اسی انداز کی ہے اور مسلم ہے۔

مولانا نانوتوی نے دارالعلوم دیوبند کی توسیع کے ساتھ ہی اپنی قیام مدارس کی کوششوں کو

بھی جاری رکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان بھر میں قیام مدارس کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ایسا لگنے لگا کہ ہندوستان میں پانچویں اور چھٹویں صدی ہجری کی تاریخ پھر دہرائی جانے لگی ہے مگر مدرسہ نظامیہ کا قیام مسلم حکمرانوں کی سرپرستی میں ہوا تھا اور دارالعلوم دیوبند اور اسی طرز کے دوسرے مدارس کا قیام محض ہندوستان کی غریب اور مفلوک الحال عوام کے چندوں کے بدولت ہو رہا تھا جس میں مولانا موصوف اور انکے رفقاء کے خلوص اور جذبہ للّٰہیت کو خاص اہمیت حاصل تھی اور انھوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے جس قسم کی مردم سازی، ذہن سازی اور فضا سازی کی وہ حیرت انگیز تھی۔ انھوں نے قیام مدارس کے ساتھ ہی جہاں لوگوں میں دین ومذہب کا جذبہ پیدا کیا وہیں لائق فائق اور رضا کارانہ جذبہ رکھنے والے باصلاحیت افراد کی تلاش کر کے انکی صلاحیتوں کو اپنی تحریک کے مفاد میں استعمال کیا اور کتاب وسنت اور خدا ورسول سے انکا رشتہ قائم کر کے دین ودنیا میں سرخروئی کے تصور کو انکے دلوں میں جاگزیں کیا اور یہ ثابت کر دکھایا کہ اسلامی علوم اور قرآن واحادیث میں آج بھی وہی توانائی موجود ہے اور ان سے آج بھی احیائے اسلام کا عظیم الشان کام لیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس کے لئے مناسب منصوبہ بندی، خلوص وللّٰہیت، سمت سفر کا تعین اور منزل مقرر ہو چنانچہ انھیں خطوط پر انھوں نے دارالعلوم دیوبند کو اپنی تحریک کا مرکز اور چھاونی بنا کر اس کا عملی نمونہ پیش کر دکھایا اور درج ذیل بنیادی محوروں پر اپنے تعلیمی تصورات کی تشکیل کی۔

(ا) **نظام تعلیم وتربیت:**۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اپنی قیام مدارس کی تحریک اور تعلیم کا بنیادی پتھر نظام تعلیم وتربیت کو تسلیم کرتے ہوئے دارالعلوم دیوبند میں جس نظام تعلیم وتربیت کو عملی طور پر پیش کیا اس کے لئے اقامتی درسگاہ لازمی تھی اور اس وقت ہندوستان میں شاید کوئی ایسی درسگاہ موجود نہیں تھی جو طلبہ کی تعلیم وتربیت کے ساتھ ان کے قیام وطعام کی سہولیات کا بھی بندوبست کرتی ہو دہلی، لکھنؤ، خیرآباد، جونپور اور وسطی وجنوبی ہندوستان میں اگرچہ دینی تعلیم کے

بعض ادارے قائم تھے مگر اقامتی تعلیمی نظام تقریباً ہر جگہ مفقود تھا لہٰذا مولانا نے اپنے منصوبے کے تحت اقامتی درسگاہ کا انتظام کیا کیونکہ انھوں نے دہلی کے طلبہ کی حالت زار اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اس کے علاوہ طلباء اپنی تعلیمی پیاس بجھانے کے لئے مختلف اساتذۂ فن کے یہاں بھی مارے مارے پھرتے رہتے تھے چنانچہ انھوں نے اقامتی درسگاہ کے قیام کو رواج دیا اور طلبہ کے لئے طعام اور دوسری ضروری سہولیات کی فراہمی پر بھی توجہ دی تاکہ طلباء بلا کسی پریشانی کے پوری یکسوئی اور سکون کے ساتھ تعلیم و تعلم میں مصروف عمل ہوکر اپنی تعلیم و تربیت کی تکمیل کرسکیں۔

دارالعلوم کے قیام سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کا جو نظام تعلیم و تربیت رائج تھا اسمیں عموماً طلباء ملک کے مختلف علاقوں میں موجود اہل فن سے جاکر تعلیم حاصل کرتے تھے اور اسکے لئے مختلف قسم کی پریشانیوں سے دوچار ہوتے تھے جس سے پورا تعلیمی نظام سست روی اور عددی محدودیت کا شکار تھا۔ مولانا نے دارالعلوم دیوبند میں جو نظام تعلیم و تربیت رائج کیا اور جس کو نمونہ بناکر ہندوستان بھر میں قائم ہونے والے مدارس میں بھی رائج کیا گیا وہ کافی وسیع اور مقصدی تھا جس میں لائق فائق افراد کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر پر خاص توجہ دی گئی تھی تاکہ ایسے افراد تیار کرکے فراغت کے بعد ان علاقوں میں بھیجے جائیں جو یا تو اپنے یہاں مدرسہ قائم کریں یا فراغت کے بعد تعلیم و تعلم سے وابستہ ہوکر قیام مدارس کی تحریک اور ان کے نظام تعلیم و تربیت کو فروغ دینے میں معاون بن سکیں تاکہ ہندوستان میں چراغ سے چراغ جلانے کی عظیم الشان تعلیمی روایت قائم ہو چنانچہ وہ اپنے اس مقصد میں توقع سے کہیں زیادہ کامیاب ہوئے اور ہندوستان بھر میں ان کا قائم کردہ نظام تعلیم و تربیت دینی مدارس کا مقبول ہوا اور اسکی خوب توسیع و اشاعت اور پذیرائی ہوئی۔

(۲) نصاب تعلیم:- ہندوستان میں رائج مسلم نظام تعلیم میں طریقۂ تعلیم اور نظام تعلیم پر سب سے پہلے عہد سکندر لودی میں توجہ دی گئی اور اسلامی نظام تعلیم کے نصاب میں معقولات کی بھی

شمولیت کی گئی۔ محمد تغلق جو اپنے دور کا زبردست مدبر اور ماہر تعلیم تھا اور جسے تاریخ میں "ماہر علوم معقولات" کہا گیا ہے اس کے عہد حکومت میں بھی عہد سکندر لودی کا ہی ترتیب کردہ نصاب رائج رہا چنانچہ جہاں تک معقولات میں محمد تغلق کی مہارت کی بات ہے وہ اسکی ذاتی دلچسپی تک ہی محدود تھا اور عمومی تعلیمی نصاب حسب سابقہ اعتدال پسندی سے ہمکنار رہا۔

ہندوستان میں اسلامی تعلیم اپنے پہلے اور دوسرے دور میں کسی بڑی تبدیلی کا شکار نہیں ہوئی لیکن اپنے تیسرے دور میں جو عہد اکبری میں شروع ہوا تھا تعلیم میں مختلف تغیر وتبدل رونما ہوا اس دور میں میر فتیح اللہ شیرازی جیسے ماہر تعلیم نے ہندوستانی تعلیم میں معقولیت کو ترجیح دی اور نصاب تعلیم میں منطق، فلسفہ، طبیعات، نجوم اور ریاضیات وغیرہ مضامین نہ صرف شامل کیا گیا بلکہ انھیں بنیادی حیثیت دی گئی اور طب کی تعلیم جو ابتک عام تعلیم کا حصہ ہوا کرتی تھی اسکے لئے الگ سے خصوصی مدارس کا قیام کیا گیا۔ جہانگیر اور شاہجہان کا دور مسلم تعلیم کا چوتھا دور تصور کیا جاتا ہے اس دور میں تعلیم کے جمالیاتی پہلو کو اہمیت دیتے ہوئے فنون لطیفہ کی تعلیم کو فوقیت دی گئی۔ اورنگ زیب ایک قابل حکمران ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور تعلیم کے بارے میں ایک واضح اور وسیع نظریے کا حامل تھا۔ اس نے اپنے دور میں عربی زبان وادب اور دینیات کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی اس نے اپنے تعلیمی نظریے میں دو یا ایک غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے وہ جس نظام تعلیم کا نفاذ کرنا چاہتا تھا وہ کئی لحاظ سے مفید تھا مگر وہ اپنی جنگی مصروفیات اور عدیم الفرصتی کے سبب نہ تو اپنا نظام تعلیم ہی رائج کر سکا اور نہ ہی نصاب تعلیم میں عملی طور پر کوئی بنیادی تبدیلی ہی کر سکا اسلئے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم اپنے پانچویں دور میں انقلاب آفریں تصورات کے باوجود کوئی اہم انقلابی کارنامہ انجام نہ دے سکی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جو ہندوستان میں ایک نئی سیاسی فکر اور انقلابی نظریے کے حامل تھے اور جن کا اپنا مرتب کردہ مخصوص نصاب تعلیم بھی تھا۔ جس میں علم حدیث کو بنیادی حیثیت

حاصل تھی۔ چنانچہ مولانا نانوتوی نے دارالعلوم دیوبند میں جس نصاب تعلیم کو رائج کیا اس کا بنیادی ڈھانچہ شاہ ولی اللہ کے نصاب تعلیم سے ہی ماخوذ ہے جس میں لکھنؤ کے درس نظامیہ دہلی کے درس حدیث اور خیرآباد کی معقولات کی آمیزش سے مولانا نانوتوی نے ایک معتدل اور متوازن نصاب تعلیم بنادیا تھا جو ہندوستان اور دیگر ملکوں میں مسلمانوں کی دینی ضروریات کے عین مطابق تھا اور جو اپنے دور میں غدر اور حریت پسند علماء کی تیاری کے لئے کافی تھا اور تحریک دیوبند اور تحریک قیام مدارس کے مقاصد کی تکمیل وفروغ اور دینی فکری اور تعلیمی آزادی کے لئے انتہائی مفید وکارآمد تھا۔ چنانچہ آنے والے دنوں میں اس نصاب تعلیم نے جو اثرات مرتب کئے وہ تاریخ میں روز روشن کی طرح عیاں ہیں اس نصاب تعلیم کے فارغین میں قیام مدارس کی ترقی کے ساتھ ہر طرح کی غلامی کے خلاف ذہن سازی، جذبۂ حریت پسندی، جذبۂ قومیت، وطن پرستی کی توسیع اور آزادی فکر وعمل کا انقلاب آفریں کارنامہ انجام دیا جس نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا محمد حسن امروہوی، انور شاہ کشمیری، مولانا محمد حسین مدنی، مفتی عزیز الرحمٰن، مفتی شمعون، مفتی کفایت اللہ، مولانا محمد شفیع اور مولانا محمد اشرف علی تھانوی جیسی نابغۂ روزگار شخصیات پیدا کیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں اپنی دوربین نگاہوں اور بصیرت وبیناپن سے کام لیتے ہوئے جس قسم کے نصاب تعلیم کی تشکیل کی تھی وہ وقت اور حالات وتقاضات کے عین موافق تھا اس لئے اس نے انقلاب آفریں افراد پیدا کئے۔ کاش ۱۹۴۷ء کی آزادی اور ہندوستان کی تقسیم کے بعد مولانا نانوتوی کیطرح مستقبل کی دینی اور فکری ضروریات کے پیش نظر ویسا ہی نصاب ترتیب دیکر دینی مدارس میں لاگو کیا گیا ہوتا تو آج بھی ان مدارس سے ویسے ہی انقلاب آفریں کارنامے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

(۳) ماہر فن اساتذہ: - دارالعلوم کے قیام سے قبل مسلم طلباء ملک کے مختلف شہروں، قصبوں اور علاقوں میں موجود ماہر فن اساتذہ سے ان کے مستقر پر جاکر تعلیم حاصل کرتے تھے اور چونکہ

تعلیم کا رواج بھی کافی محدود اور زوال پذیر تھا اس لئے اساتذہ اور طلباء دونوں کا فقدان تھا مگر اس طریقہ سے طلباء کو کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مولانا نانوتوی خود بھی درس و تدریس سے وابستہ تھے اور طلباء کی ان پریشانیوں اور دشواریوں سے بخوبی واقف۔ چنانچہ قیام دارالعلوم کے ساتھ ہی انھوں نے ماہر فن اساتذہ سے دارالعلوم دیوبند کو مزین کرنے پر خاص توجہ دی تاکہ یہ سلسلہ ملکی پیمانے پر فروغ پاسکے اور دارالعلوم کے طرز پر قائم ہونے والے مدارس میں بھی اس کا بندوبست ہو سکے۔

مولانا نے دارالعلوم دیوبند میں جہاں ماہر فن اساتذہ کا انتظام کیا وہیں اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے ایسے اساتذۂ فن کی تعلیم و تربیت پر زور دیا جو فراغت کے بعد مختلف علاقوں میں قائم ہونے والے مدارس میں درس و تدریس کی بخوبی خدمت انجام دیں سکیں اور قیام مدارس کی تحریک اور ماہرین اساتذہ کی تیاری کے سلسلے کو آگے بڑھا سکیں اور تعلیم و تعلم میں آزادانہ تعلیمی و تربیتی ماحول سازی میں معاون بن سکیں اور اساتذۂ فن اپنی فطری دلچسپی اور فنی صلاحیتوں سے طلباء میں دینی حمیت، تعلیمی میلانات اور حریت پسندی کی ذہنیت کو پروان چڑھا سکیں۔ چنانچہ ان کے اسی عظیم الشان تعلیمی منصوبے اور اس کی عملی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ دارالعلوم کے قیام کے بعد نصف صدی کے اندر ہی براعظم، ایشیاء و افریقہ میں دارالعلوم اور اس طرز کے دوسرے مدارس کے فارغین اور اساتذہ نے اپنے طرز کا تعلیم و تربیت کا ایک منظم طریقہ رائج کر دیا تھا جس کے بعض اثرات آج بھی مدارس کی تعلیم میں محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

<u>اخلاقی تربیت اور عوامی رابطے:</u>- دیوبندی یا قاسمی نظام تعلیم و تربیت میں اخلاقیات اور روحانیات پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی اور اخلاقی و روحانی تربیت کا تمام تر دارومدار نمونہ کی شخصیت پر منحصر ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا قاسم انکے رفقاء اور شاگردان نے مولانا کے نقش قدم پر چل کر اور انکے طریقۂ تعلیم و تربیت کو مشعل راہ بنا کر ایثار، سادگی، اولوالعزمی، بلند نگاہی اور بے باکی کو اپنی

عملی زندگی کا محور بنایا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ان کے شاگردان جب اس ماحول میں ڈھل کر نکلے تو اپنے علاقے کی عوام کے لئے آئیڈیل بن گئے جن میں صداقت، شرافت، مساوات اور قرآن وسنت کے عملی طور طریقوں کی کارفرمائی تھی اور یہ سلسلہ چلتا رہا اور تقریباً چار واسطوں تک تو اپنی مثال رکھتا تھا۔ اس کے بعد ان اثرات میں کمی واقع ہونے لگی اور اب تو خال خال ہی ایسے علماء نظر آتے ہیں جو مولانا قاسم اور انکے رفقاء وشاگردوں کی طرح آئیڈیل اور نمونے کی شخصیت بن کر سماج میں اصلاح وفلاح کا نمایاں کردار ادا کرسکیں اور آج کے ماحول میں ملت کی قیادت کا صحیح کارنامہ انجام دے سکیں۔

کسی بھی تحریک کی کامیابی اور نسل درنسل اسکی اثر پذیری کی بقاء کے لئے عوامی رابطے کی بنیادی اہمیت ہوتی ہے کیونکہ اس سے تحریک اور اس کے مقاصد کی جڑیں انتہائی گہرائی اور گیرائی تک پیوست ہوجاتی ہیں اور کافی دنوں تک اپنی صبرباری کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ مولانا عوامی رابطے اور اس کے اثرات ومفادات سے بخوبی واقف تھے چنانچہ وہ اور ان کے رفقاء نے غریب عوام اور ان کے خلوص کو اہمیت دی اور چونکہ مسلم معاشرے میں غرباء ہی کی اکثریت ہے اس لئے رائے عامہ مدارس کے حق میں تیار ہونے میں کافی آسانی ہوئی اور قیام مدارس کی تحریک کو توقع سے زیادہ کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے فارغین نے جہاں اپنے اپنے علاقوں میں جاکر درس وتدریس کی خدمات انجام دیں وہیں علاقے کے مسلمانوں کی عام زندگی میں برابر کے شریک ہوکر عوامی زندگی کا حصہ بن گئے۔

مولانا نانوتوی نے جس زمانے میں دارالعلوم دیوبند کو قائم کیا تھا اور قیام مدارس کی تحریک کو فروغ دینے کی کوشش کی تھی وہ ہر طرح کی زبوں حالی کا زمانہ تھا۔ انگریز حکمرانوں نے مسلم اوقاف پر ناجائز قبضہ کرلیا تھا۔ ریاستیں یا تو ضبط کرلی گئیں تھیں یا ختم ہوچکی تھیں امراء تباہ حال تھے۔ ایسے میں انھوں نے حالات کا پوری گہرائی سے تجزیہ کیا اور امراء ورؤسا کی عنایات کے بجائے

غریب عوام کے معمولی معمولی چندوں پر بھروسہ کیا جس سے وہ خود بخود مدرسوں کے رابطے میں آگئے۔ ان کا اعتماد حاصل ہوا۔ باہمی روابط کو فروغ ملا اور مالی اعانت کے ساتھ ساتھ عوام کی اخلاقی اعانت بھی ملی جس کی بدولت بڑے سے بڑا کارنامہ اور منصوبہ انجام پذیر ہونے لگا اور تحریک دیوبند اور قیام مدارس میں تیز رفتاری پیدا ہوگئی اور ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر، قصبہ یہاں تک کہ دیہی علاقوں میں قیام ہونے لگا اور مولانا نانوتوی کی یہ تحریک اپنے بام عروج تک پہونچنے میں کامیاب ہوگئی۔ یعنی اسلامی مدارس کا

مولانا کے رفقاء اور شاگردوں نے بھی انہیں خطوط پر کام کر کے مثالی نمونہ پیش کیا اس کے علاوہ مولانا الیاس نے تحریک دیوبند کی راہ پر چل کر تبلیغی جماعت کا کام شروع کیا اور عالمی سطح پر انھیں کامیابی ملی۔ مولانا محمد علی جوہر نے تحریک خلافت کے بینر تلے مہاتما گاندھی کو اسی عوامی رابطے کے طرز پر ہندوستان کی تحریک آزادی کو راہ دکھا کر ملک سے انگریزی حکومت کے خاتمے اور حصول آزادی میں کامیابی حاصل کی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تحریک دیوبند اور قیام مدارس کی تحریک اپنے وقت کی تحریک دیوبند اور قیام مدارس کی تحریک اپنے وقت کی عظیم الشان تحریک تھی اور مولانا کی شخصیت ایک انقلاب آفریں اور عہد ساز شخصیت تھی۔

تحریک دیوبند نے ایک صدی کے عرصے میں اپنا انقلابی کارنامہ انجام دیا ہے جس کے نتیجے کے طور پر آج ہندوستان میں تقریبا چھتیس ہزار مدارس قائم ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کی بنیادی اور دینی تعلیم کی ضرورت کو پوری کر رہے ہیں۔ سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک اور تحریک دیوبند کے ملے جلے اثرات کے تحت آج کئی بڑے تعلیمی ادارے ہندوستان میں موجود ہیں۔ عصری اداروں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، عثمانیہ یونیورسٹی اور جامعہ ہمدرد وغیرہ نے مسلمانوں میں عصری تعلیم فروغ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں لیکن جو عوامی مقبولیت مولانا نانوتوی کے قیام مدارس کو حاصل ہوئی اگر ویسی ہی عوامی مقبولیت سرسید احمد خاں

کی عصری تعلیم کو بھی حاصل ہوگئی ہوتی تو مسلمانوں میں جو دینی اور عصری تعلیم میں عدم توازن پایا جاتا ہے شاید نہ پیدا ہوتا اور مسلمان تعلیم کے میدان میں کئی گنا آگے ہوتے کاش جس طرح مسلمانوں نے دینی تعلیم کے مدارس کھولے اسی طرح عصری علوم کے لئے بنیادی عصری اسکول پر بھی توجہ دیدیتے تو اب سے بھی ہندوستان کی مسلم اقلیت میں تعلیمی بیداری کے ساتھ ساتھ باوقار اور باعزت زندگی کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

باب پنجم

تعلیمی تصورات

- ☆ مولانا محمد قاسم نانوتوی کا اساسی اصول ہشتگانہ
- ☆ مولانا شاہ رفیع الدین کا انتظامی اصول ہشتگانہ
- ☆ انگریزی انخلاء کا تصور
- ☆ غلامی مخالف تصور
- ☆ احیاء اسلام کا تصور
- ☆ انگریزی زبان و تعلیم کا تصور
- ☆ تعلیمی و تربیتی تصور
- ☆ تعلیمی آزادی کا تصور
- ☆ رشتہ استاد و شاگردی کا تصور
- ☆ طریقہ تعلیم کا تصور
- ☆ مقاصد تعلیم کا تصور

تعلیمی تصورات

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا اساسی اصول ہشتگانہ

(۱) اصل اول یہ کہ تامقدور کارکنان مدرسہ کی ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں۔ خیر اندیشانہ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے۔

(۲) ابقائے طعام طلبہ بلکہ افزائش طعام طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشان مدرسہ مساعی کریں۔

(۳) مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو۔ اپنی بات بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواست جب اس کی نوبت آئے کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالف رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائیگا۔ القصہ تہہ دل سے ہر وقت مشورہ اور اس کے پس دپیش میں اسلوبیٔ مدرسہ ملحوظ رہے۔ سخن پروری نہ ہو اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل وجان قبول کریں گے۔ نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کرے خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی اور وارد وصادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر خواہ ہو اور نیز اسی وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے مشورہ کی نوبت نہ آوے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

(۴) یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علمائے

روزگار خود ہوں اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئیگی تو مدرسہ کی خیر نہیں۔

(۵) خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہوچکی ہے یا بعد میں کوئی انداز مشورہ سے تجویز ہو پورہ ہوجایا کرے ورنہ یہ مدرسہ اول تو خود آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

(۶) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں تب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ چلے گا اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اور امداد غیبی موقوف ہوجائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائیگا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک قسم کی بے سروسامانی رہے۔

(۷) سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

(۸) تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

بحوالہ ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی دینی مدارس نمبر ۱۸ راکتوبر ۲۰۰۰ء صفحہ ۹۔

حضرت مولانا شاہ رفیع الدینؒ مہتمم دارالعلوم کا انتظامی اصول ہشتگانہ

(۱) ہر کارخانہ کے امور جزئیہ کی بنا ایک شخص کی رائے پر رہنی چاہیئے۔ اسی قاعدہ پر اس کارخانہ کے امور جزئیہ میں کسی صاحب کو اہل مشورہ میں سے دخل نہ ہو۔ الا مشورہ اور رائے کہ وہ اپنے موقع پر اظہار فرمادیں جیسا کہ اہل شوریٰ ملکر پسند کریں۔

(۲) امور جزئیہ میں جو کوئی صاحب بندہ کے مددگار ہونگے یا اچھا مشورہ دینگے بندہ انکا

مشکور ہوگا مگر انجام اسکا موقوف بندہ ہی کی رائے پر رہنا چاہیئے۔

(۳) جس کسی صاحب کو خواہ اہل شوریٰ خواہ عام مخلوق۔ کوئی امر قابل اعتراض معلوم ہو تو مہتمم سے مزاحمت نہیں۔ جلسہ شوریٰ میں پیش کرے اس کو طے کرالیں اور جیسا قرار پائے اس کے انجام پر مہتمم کو عذر نہ ہوگا۔

(۴) مشورے کے جلسے جب کبھی ہوں بے حاضری مہتمم نہ ہونگے۔ اگر چہ اس کی ہی کسی بات پر خوردہ ہو۔ یوں اہل شوریٰ اختیار اعتراض کا ہر وقت ہے مہتمم کو موقع جواب کا۔

(۵) مہتمم اگر اہل شوریٰ کے اجتماع تلک کسی امر ضروری کے انجام پر انتظار نہ کر سکے تو بذریعہ خط سب صاحبوں کو اطلاع دیگا اور ضروری امر کو سب صاحبوں کو قبول کرنا ہوگا۔

(۶) آمدنی مدرسہ کی مہتمم کے ہاتھ میں رہے گی کیونکہ صرف ضروریہ کے لیئے کسی قدر روپیہ مہتمم کے ہاتھ میں رہنا ضروری ہے۔ حاجت ضروریہ سے زیادہ روپیہ جمع ہو جایا کریگا تو خزانچی کے پاس جمع کردیا جائیگا۔

(۷) ہر روز وقت مقررہ مدرسہ پر مہتمم مدرسہ بھی جایا کریگا اور اسی وقت میں امور متعلقہ مدرسہ کو انجام دیا کریگا۔

(۸) مناسب ہے کہ سب اہل شوریٰ مل کر اپنے دستخط اس معروضہ پر فرمادیں کہ مہتمم کو جائے سند رہے۔

دستخط دستخط دستخط

العبد محمد قاسم العبد ذوالفقار علی العبد محمد عابد (تحریر ۳ رذی قعدہ ۱۲۸۸ھ)

مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تعلیمی تصورات میں ان کے اساسی اصول ہشتگانہ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں نیز مولانا شاہ رفیع الدین مہتمم دارالعلوم دیوبند کا انتظام اصول ہشتگانہ بھی

مولانا کے تعلیمی تصورات کی افہام وتفہیم میں کم معاون نہیں ہے۔ کیوں کہ اس پر خود مولانا موصوف کے بھی دستخط ہیں لہٰذا ان کے تعلیمی تصورات میں یہ دونوں اصول ہشتگانہ بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا اسی لئے دونوں اصول ہشتگانہ تحریر کرا دیا گیا ہے۔

جیسا کہ گذشتہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ مولانا نانوتوی ولی اللہی تحریک کے پروردہ دہلی کالج کے تعلیم یافتہ مولانا مملوک علی کے شاگرد اور حاجی امداداللہ مہاجر مکی کے خلیفہ تھے انھوں نے ہندوستان میں مسلم حکومت کا جنازہ بھی نکلتے دیکھا تھا اور انگریزوں کا غاصبانہ تسلط ہوتے بھی اوران کے ظلم واستبداد کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اس کے شکار بھی ہوئے تھے۔ انگریزوں کے ظلم واستبداد، ہندوستانی عوام اور والیان ریاست مخالف پالیسیوں، ہندوستانی دولت کو دونوں ہاتھ سے لوٹ کر انگلستان لے جانے اور بدلے میں ہندوستانیوں کو غم وافلاس اور مصائب وگرانی میں مبتلا کرنے کی حکمت عملی سے بھی وہ بخوبی واقف تھے جس کے ردعمل کے طور پر ۱۸۵۷ء کی عوامی بغاوت رونما ہوئی تھی اور اس عوامی بغاوت میں وہ اپنے پیرومرشد اور دیگر رفقاء کے ساتھ مجاہدانہ انداز میں شریک بھی ہوئے تھے اور شاملی کے محاذ پر اپنی بہترین عسکری سربراہی میں انگریزوں کو پسپا بھی کر دکھایا تھا مگر جب ملکی حالات پلٹ گئے اور ہندوستان میں انگریز کامیاب ہوگئے تو مجبوراً انھیں بھی حالات کا شکار ہونا پڑا تھا۔ بغاوت اور بغاوت میں ہندوستانیوں کی ناکامی کے بعد ظالم انگریزوں نے ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ جس ظالمانہ سفاکانہ اور انسانیت سوز سلوک کا مظاہرہ کیا تھا وہ شاید کم ظرف سے کم ظرف دشمن بھی اپنے کسی دشمن کے ساتھ نہیں کرسکتا ہے جس کا کربناک منظر مولانا نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور جس کے وہ چشم دید گواہ بھی تھے۔ اس کے علاوہ عیسائی مشنریوں، آریہ سماجیوں، سناتن دھرمیوں اور شدھی سنگھٹن والوں نے انگریزوں کے ایما پر جس قسم کے اسلام مخالف کارنامے انجام دے رہے تھے اس کا مولانا نے اپنے زمانے میں دنداں شکن جواب بھی دیا تھا۔

انگریزوں سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کا جو نظام تعلیم رائج تھا اور جس کے لئے ہندوستان بھر میں مسلمانوں کے مدارس، خانقاہیں اور مکاتب قائم تھے اور جنھیں انگریزوں نے مذکورہ عوامی بغاوت کے انتقام پوری طرح تباہ و برباد کر دیا تھا اور ہندوستان میں غیر اسلامی رسم و رواج اور شرک و بدعات کا عام رواج تھا اور جس کے خاتمہ کے لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی انقلابی تحریک کا بنیادی مقصد قرار دیا تھا اس کی ابھی پوری طرح ضرورت برقرار تھی اور اس کو بغاوت کے بعد کے حالات میں نئے سمت و جہات کے تعین کے ساتھ نئی حرکی توانائی پیدا کر کے آگے بڑھانے اور اس میں فعالیت پیدا کرنے کی بھی ضرورت تھی تا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے عام طبقے کو کتاب و سنت کے مطابق اسلامی تعلیمات اور طرز زندگی سے روشناس کرایا جا سکے اور بغاوت میں مسلمانوں کی ناکامی اور بغاوت کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ بہیمانہ اور انسانیت سوز برتاؤ کا انتقام لینے کے ساتھ ہی ہندوستان سے انگریزوں کو نکال بھگانے کی نئی حکمت عملی تیار کرنے اور اس کے مطابق افراد تیار کرنے کی ایک پرامن منظم اور ذہنی و فکری اعتبار سے مستحکم اور دیرپا تحریک آزادی کے لئے فضا سازی اور ذہن سازی کی جا سکے تا کہ ہندوستان سے انگریزوں کے ساتھ ساتھ انکی مغربی تعلیم کے منفی اثرات اور تہذیبی یلغار جس میں ہندوستانی اور اسلامی تہذیب و ثقافت کو خاص اہمیت دی جاتی تھی اس کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کی غرض سے اسلامی تعلیم کا فروغ اور ہند اسلامی ثقافت کی اہمیت و افادیت اور اس کے عزو وقار اور سربلندی کے لئے بتدریج ایسے علماء، فضلاء اور عام لوگوں کی جماعت تیار کی جا سکے جو آنے والے دنوں میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں چنانچہ انھیں مقاصد کے پیش نظر دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تھا اور اسے ہی مرکز بنا کر قیام مدارس کو فروغ دیا گیا تھا اور مذکورہ بالا تناظر میں ہی انھوں نے اپنے تعلیمی تصورات کی تشکیل کی تھی۔ چنانچہ مولانا موصوف نے مختلف مواقع اور اوقات میں اپنے تعلیمی تصورات کا اظہار بھی کیا

تھا۔

مولانا نے اپنے تحریر کردہ اساسی اصول ہشتگانہ میں جن امور کی وضاحت کی ہے نیز مولانا شاہ رفیع الدین صاحب اپنے انتظامی اصول ہشتگانہ میں جن باتوں کی تشریح کی ہے اس سے جہاں مولانا نے کے تعلیمی تصورات کی افہام وتفہیم میں مدد ملتی ہے وہیں دارالعلوم دیوبند کے قیام کے ابتدائی دنوں میں اسے جن اصولوں پر کاربند کر کے قیام مدارس کے سلسلے میں بطور نمونہ پیش کیا گیا وہ آج بھی مدرسہ کے انتظام وانصرام میں بنیادی اور اولین پتھر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں اس بات کی بھی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مولانا رفیع الدین صاحب کا انتظامی اصول ہشتگانہ بھی دراصل مولانا نانوتوی کے ہی اساسی حصول ہشتگانہ سے متاثر ہو کر تحریر کیا گیا ہے۔ نیز خود اس پر مولانا نانوتوی دستخط بھی ثبت ہیں۔ ان دونوں اصولوں سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے لئے جس نظام تعلیم کی بنیاد رکھی تھی وہ خالص خلوص نیک نیتی اور للہیت پر مبنی تھا اور اس میں ہندوستان کی غریب اور مفلوک الحال عوام ان کی مذہبی تعلیم اور اس تعلیم کے ذریعہ عام لوگوں میں مذہبی بیداری اور کتاب وسنت کے احیاء کے ساتھ غریبوں کے تعاون اور ان کی سرپرستی کو خاص اہمیت دی گئی تھی۔ مولانا خود تا عمر جمہور کے نمائندہ تھے اور انھوں نے اپنے تعلیمی تصورات میں غریب کے نونہالوں کے بچوں کی تعلیم ان کے قیام وطعام کی سہولت تاکہ وہ اطمینان وسکون کے ساتھ دینی تعلیم کے حصول میں دلچسپی لے سکیں اور پھر فراغت کے بعد اسی تحریک کے جز بن کر اسے آگے بڑھانے اور فروغ دینے میں معاون بن سکیں اور قرآن وسنت کے احیاء کے ساتھ ہی اپنی خداداد صلاحیت کو دین کے استحکام میں لگا کر لارڈ میکالے جس نے اپنی تعلیمی پالیسی کے نفاد کے بارے میں کہا تھا کہ ’’ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہوں اور روح وفکر کے لحاظ سے عیسائی‘‘ کا جواب بن سکیں جیسا کہ مولانا نے زبان حال سے بآواز بلند کہا بھی تھا

کہ ہماری تعلیم کا مقصد بقول قاری محمد طیب صاحب ''ایسی نسل تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندی، سندھی، افغانی، ایرانی، خراسانی و ترکستانی ہوں لیکن روح و فکر کے لحاظ سے عربیت و اسلامیت کی روح سے معمور اور بھرپور ہوں۔''

انگریزی انخلا کا تصور:۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے سیاسی استحکام کے لئے بطور خاص تعلیم کو ذریعہ بنایا تھا تاکہ ہندوستانیوں میں سے ہی ان کی ہمنوا اور وفادار رعایا کی جماعت پیدا ہو سکے چنانچہ انگریزوں کے اسی تعلیمی تصور کے جواب میں مولانا نانوتوی نے ایک ایسا تعلیمی تصور تشکیل دیا تھا کہ ہندوستان میں احیاءِ اسلام کے ساتھ انگریزوں کے انخلا کا ذریعہ بن سکے اور اس تعلیم کے توسط سے علماء و فضلاء کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو سکے جو ہندوستان کی غلامی اور انگریزوں سے نجات دلانے میں ملک گیر پیمانے پر مجاہدانہ، مفکرانہ، اور رہنمایانہ کردار ادا کر سکے تاکہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کا بدلہ بھی لیا جا سکے اور ہندوستان کو ان کے غاصبانہ تسلط سے آزاد بھی کرایا جا سکے چنانچہ بعد کے حالات میں ان کے پیروں اور فارغین دیوبند نے عملاً ایسا کر کے دکھایا بھی۔ مولانا احسن گیلانی نے بھی مولانا کے مذکورہ حریت پسندانہ تعلیمی تصور کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی جو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم تھے کے فرستادہ کی حیثیت سے حضرت الاستاذ شیخ الہند مولانا محمود حسن کی خدمت میں حاضر ہوا اور بطور پیغام رساں حضرت سے دریافت کیا کہ آپ کا صحیح سیاسی مسلک کیا ہے؟ یہ پیغام سناتے ہی میں نے دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہوا اور ارشاد فرمایا حضرت الاستاذ (مولانا محمد قاسم نانوتوی) نے اس مدرسہ کو کیا درس و دریس اور تعلیم و تعلم کے لئے قائم کیا تھا۔ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا ہے جہاں تک میں جانتا ہوں ۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد ادارہ قائم کیا گیا تھا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے کہ جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔''

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا نانوتوی نے بھی تعلیم کو بطور ذریعہ کے استعمال کیا تھا اور ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کی تلافی اور کتاب وسنت کے احیاء کا میڈیم بنایا تھا اور اپنے اس مقصد وتصور میں وہ مکمل طور پر کامیاب بھی ہوئے جیسا کہ ان کے شاگرد رشید دارالعلوم دیوبند کے اولین طالب علم شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے دیگر ساتھیوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں رہنمایانہ کردار ادا کر کے ثابت کر دکھایا۔ مولانا محمود حسن نے انگریزوں کے خلاف ایک خفیہ تنظیم قائم کی تھی جس کی عملی سرگرمیاں تاریخ آزادی میں ''ریشمی رومال تحریک'' کے نام سے مشہور ہے اور جس کا خاص مقصد باہری ملکوں سے امداد حاصل کر کے ہندوستان کو آزاد کرانا اور اس کے لئے عالمی سطح پر ہندوستان کی آزادی کے لئے رائے عامہ ہموار کرنا تھا چنانچہ ۱۹۱۵ء میں مولانا عبیداللہ سندھی اور راجہ مہندر پرتاپ سنگھ کو کابل بھیجا گیا اور سرحد کو اس خفیہ تحریک کا مرکز بنا کر اپنے مشن کو آگے بڑھانے کے لئے جرمنی کے قیصر سے ملاقات بھی کی گئی مگر اس تحریک کا راز فاش ہو جانے کے سبب مولانا محمود حسن اور مولانا حسین احمد مدنی کو حجاز میں گرفتار کر کے مالٹا میں قید کر دیا گیا اور مذکورہ دونوں حضرات اسیر مالٹا کے نام سے مشہور بھی ہو گئے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن جو اس تنظیم وتحریک کے اصل سربراہ روح رواں تھے اور انگریزوں کے خلاف عالمی پیانے پر رائے عامہ ہموار کرنے میں سرگرم عمل تھے انھوں نے باقاعدہ طور پر ہندوستان کی جلاوطن حکومت کا قیام کیا۔ اور ترک موالات اور عدم تعاون کی تحریک کو کامیاب بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا اور انگریزی اسکولوں اور انگریزی تعلیمی پالیسی وسرکاری تعلیم کا بائیکاٹ کرنے کے ساتھ ہی قومی تعلیم کے تصور کو متعارف کرایا اور اپنی انتہائی بیماری کی حالت میں ہندوستان میں قومی تعلیم کے ادارہ کی حیثیت سے علی گڈھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام میں بنیادی رول ادا کیا اور اس کی افتتاحی تقریب میں جو معرکتہ الآرا تقریر کی وہ

ہندوتان کی قومی تعلیم کی راہ میں مشعل راہ ثابت ہوئی۔ ہندوستان کی آزادی میں بڑی سے بڑی قربانی دی۔ قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں اور سبھاش چندر بوس سے بہت پہلے ۱۹۱۵ء میں کابل کو دارالسلطنت بنا کر سب سے پہلی جلا وطن حکومت تشکیل کی جس کے صدر جمہوریہ راجہ مہندر پرتاپ سنگھ اور وزیراعظم و وزیر خارجہ ڈاکٹر برکت اللہ بھوپالی کو منتخب کیا۔ اس طرح علمائے دیوبند اور فارغین دیوبند وان کے رفقاء وشاگردان نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ہندوستان کو آزاد کرایا اور تعلیم کے ذریعہ انگریزی انخلا کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر دکھایا۔

غلامی مخالف تصور:— مولانا قاسم نانوتوی اور ولی اللہی تحریک سے وابستہ دیگر تمام لوگ شروع سے ہی انگریزوں کی غلامی کے خلاف تھے۔ مولانا نانوتوی اور ان کے رفقاء تو سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ تعلیمی اور ذہنی غلامی کے بھی زبردست مخالف تھے بلکہ ذہنی اور تہذیبی غلامی کو سیاسی غلامی سے بدتر تصور کرتے تھے اور ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر قوم ذہنی غلامی سے بچ گئی تو ایک نہ ایک دن وہ سیاسی غلامی سے نجات ضرور حاصل کرلے گی اور اگر سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی غلامی بھی اختیار کریگی تو پھر نہ قومی شناخت باقی بچ پائیگی اور نہ اس کے بقا کا تصور ہی باقی رہ پائیگا چنانچہ انھوں نے انگریزوں وانکی لائی ہوئی تعلیم وثقافت کی زبردست مخالفت کی اور ہند اسلامی تہذیب اور ہندوستان میں قرآن وسنت کے احیاء کے لئے ذہنی غلامی سے بچاؤ کے لئے انھوں نے اپنے غلامی مخالف تعلیمی تصور کو بروئے کار لاکر ہندوستان میں دینی تعلیم اور دینی مدارس کے قیام پر زور دیا۔

انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے عیاری ومکاری سے اور غاصبانہ طور پر حاصل کی تھی اس لئے مسلمانوں کو ہی اپنا اصل دشمن تصور کرتے تھے۔ اور چونکہ ۱۸۵۷ء کی عوامی بغاوت میں مسلمان ہی پیش پیش تھے اگرچہ ہندو برادران وطن بھی شریک حال تھے مگر وہ

مسلمانوں کو ہی اپنا پہلا حریف سمجھتے تھے اور ہندو برادران کے ساتھ نرم پہلو اختیار کر کے اپنی پرانی کلیسائی پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' پر کاربند تھے اور مولانا انگریزوں کی اس چال کو خوب سمجھتے تھے کیونکہ انھوں نے ان کا بغور مطالعہ کیا تھا اس لئے وہ ان کی ہر چال سے واقفیت کے ساتھ ساتھ ہشیار بھی رہتے تھے وہ جانتے تھے کہ انگریزوں کی یہی چال سب سے مہلک اور خطرناک ہے جیسا کہ گورنر ہندلارڈ ایلین برانے بغاوت سے بہت پہلے ۱۸۴۳ء میں ڈیوک آف ولنگڈن کو لکھا تھا کہ'' میں اس عقیدے سے چشم پوشی نہیں کرسکتا کہ مسلمانوں کی قوم اصولاً ہماری دشمن ہے اس لئے ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضا جوئی کرتے رہیں۔'' مولانا انگریزوں کی اس چال سے بخوبی واقف تھے اور پورے سیاق وسباق کے ساتھ سمجھتے تھے کہ یہ ہندوستانیوں کو ہمیشہ غلام بنائے رکھنے کا سب سے کارگر حربہ ہے چنانچہ انھوں نے اس حربہ کو ناکام بنانے کے لئے دینی تعلیم اور کتاب وسنت کی صحیح جانکاری کے ساتھ احترام آدمیت کے جذبے کو فروغ دیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں اچھے روابط پیدا کئے اور دارالعلوم دیوبند اور اس کے طرز پر قائم ہونے والے تمام مدارس اور ان کے اراکین واساتذہ کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کی۔ قومیت کے جذبات ابھارے اور انگریزوں کو تمام ہندوستانیوں کا مشترکہ دشمن بتا کر ان کی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی کو کمزور کیا تاکہ سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ تہذیبی اور ذہنی غلامی کے ان کے سارے منصوبوں کو ناکام بنایا جاسکے چنانچہ انھوں نے وطن کی محبت کو جزو ایمان بتایا جیسا کہ عزیز احمد نے اپنی کتاب اسلامک ماڈرنزم ان انڈیا اینڈ پاکستان ۱۹۶۴ء-۱۸۵۷ء میں لکھا ہے کہ ''مولانا آزاد اور مولانا مدنی کا خیال تھا کہ قرآن میں کئی مواقع ایسے آئے ہیں جہاں مذہبی بنیادوں پر اختلاف کے باوجود ایک قوم کہا گیا ہے۔ قوم اور ملت میں فرق ہے مسلمان دوسروں کے ساتھ ملکر بھی ایک قوم ہیں۔'' (صفحہ ۱۹۲)

علمائے دیوبند نے ہندو مسلم اتحاد کو قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ حصول آزادی کے

لئے انگریزوں کے خلاف سیاسی اور ذہنی محاذ کھولا اور ہر اس اقدام کی تائید کی جس سے انگریزوں کی سیاسی اور ذہنی غلام بنائے رکھنے کی پالیسی کو کمزور کیا جا سکے اور یہ سب ان کے غلامی مخالف تعلیمی تصور کے تحت ہی ممکن ہو سکا چنانچہ ہندوستانی علماء کی جو سیاسی تنظیم جمیعتہ العلماء قائم کی گئی اور جس نے حصول آزادی میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ ہندو مسلم اتحاد اور مشترکہ قومیت اور وطن پرستی کے جذبے بیدار کئے یہ سب کے سب مولانا نانوتوی کے غلامی مخالف تصور کے ہی ثمرات تھے۔ مولانا موصوف کو اس کا بخوبی ادراک تھا ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے معاملہ میں انگریزوں کی نیت کبھی بھی صاف نہیں رہی ہے اس لئے انھوں نے جو جدید تعلیمی نظام لاگو کیا تھا اس میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی گئی تھی اور نئے تعلیمی نظام میں مذہب اسلام، ہندو دھرم اور ہندوستانی تہذیب وثقافت کو تحقیرانہ انداز سے دیکھا گیا تھا اور جدید مغربی تعلیم کے میر کارواں لارڈ میکالے نے اپنی ہندوستانی اور اسلام دشمنی میں یہاں تک کہہ ڈالا تھا کہ ''ایک یوروپی لائبریری کی ایک الماری ہندوستان اور عرب کی تمام کتابوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔'' اس کے علاوہ الفسٹن نے بھی اپنی یادداشت میں لکھا تھا کہ '' میں اعلانیہ تو نہیں در پردہ پادریوں کی حوصلہ افزائی کروں گا۔ اگر چہ مجھے گورنر صاحب سے اتفاق ہے کہ مذہبی امور میں امداد کرنے سے اعتراض کیا جائے تاہم جبتک ہندوستانی لوگ عیسائیوں کی شکایت نہ کریں تب تک ان کی تعلیم کے مفید ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں اگر تعلیم سے ان کی رایوں میں ایسی تبدیلی پیدا نہ ہو سکے کہ وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں تاہم وہ اس سے زیادہ ایماندار اور محنتی رعایا ضرور بن جائیں گے۔'' روشن مستقبل (صفحہ ۹۵)

انگریزوں کی مذکورہ تمام تر پالیسی ہندوستانیوں اور مسلمانوں کو ذہنی غلام بنائے رکھنے کی تھی تا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سیاسی غلام بنے رہیں۔ موصوف انگریزوں کی اس عیاری اور چالبازی کو بخوبی سمجھتے تھے اور اسی مقصد کے تحت انھوں نے اپنی مذہبی احیاء کی تعلیمی تحریک میں انگریزوں

کے خلاف ذہنی غلامی تصور کو خاص اہمیت دی تھی تاکہ ذہنی اور فکری آزادی کے توسط سے مستقبل میں انگریزوں کی سیاسی غلامی سے نجات حاصل کی جاسکے اور ہندوستان کی غریب اور مفلوک الحال عوام کو مذہبی تعلیم کے ذریعہ ذہنی غلام ہونے سے بچایا جاسکے۔

احیاءِ اسلام کا تصور:۔ اسلامی تعلیم میں کلام اللہ کی تفسیر اور احادیث نبوی کی مہارت یا اختصاص وغیرہ سب سے اہم موضوعات ہیں اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت نبوی ہی اسلامی شریعت کے دو بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھیں دونوں بنیادی مآخذوں سے تمام فقہی مسائل، معاشرتی احکام اور سیاسی قوانین کی تشکیل ہوتی ہے اس لئے مولانا نانوتوی نے اپنے تعلیمی تصور میں قال اللہ اور قال الرسول کو بنیادی حیثیت دی تھی اور اسلام کے دونوں اساسی مآخذوں کو بحسن وخوبی سمجھنے کے لئے اور اس مین مہارت پیدا کرنے کے لئے عربی زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دیا تھا کیوں کہ مذکورہ دونوں مآخذ اسی عربی زبان میں ہی ہیں اس لئے ان سب کی تعلیم کے لئے عربی زبان میں بھی مہارت انتہائی ضروری ہے چنانچہ انھیں خیالات کے تحت انھوں نے مذہبی تعلیم کے فروغ کو اہمیت دی تھی انکا قطعی جدید تعلیم کے متبادل یا اس کی مخالفت میں مذہبی تعلیم کے احیاء کا تصور نہیں تھا بلکہ مدارس کا قیام قرآن واحادیث کی تعلیم کے اختصاصی ادارہ کی حیثیت سے تھا بالکل اسی طرح جس طرح رڑکی میں انجینئرنگ اور اس کی مختلف شاخوں کی تعلیم کے لئے مخصوص انجینئرنگ کالج کھولا گیا تھا جو بعد میں انجینئرنگ یونیورسٹی کی حیثیت اختیار کرگیا یا ہندوستان میں زراعت کی مخصوص تعلیم کے لئے بہت سی زراعتی درسگاہیں اور اگری کلچر یونیورسٹیاں قائم ہیں اور جن کا مطلب اپنے مخصوص موضوعات کی تعلیم وتربیت ہوتا ہے نہ کہ دیگر تعلیم وموضوعات کی مخالفت۔ ٹھیک اسی نہج پر دارالعلوم دیوبند کے طرز پر ہندوستان بھر میں جو مدارس کھولے گئے وہ خصوصاً کتاب وسنت کی تعلیم اور اسلام کے احیاء کے لئے قائم کئے اور انکا قطعی یہ مقصد نہیں تھا کہ دیگر مذاہب اور تعلیمات کی مخالفت کی جائے کیونکہ

مولانا نانوتوی نہ تو کبھی جدید اور عصری تعلیم کے مخالف رہے ہیں اور نہ ہی اس تعلیم کو اسلام کے خلاف ناجائز کہا ہے ہاں وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ دارالعلوم جن مخصوص مقاصد کے تحت قائم کیا گیا ہے اس میں جدید یا عصری تعلیم کی پیوندکاری کر کے نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم کی مصداق نہ بنایا جائے ان کا خیال تھا کہ عصری تعلیم کے لئے سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی ادارے پہلے سے قائم ہیں لہٰذا دارالعلوم کی اسلامی تعلیم کو ہی دارالعلوم اور دیگر مدارس میں جاری رکھا جائے تاکہ ہندوستان میں احیاء اسلام کے ساتھ قرآن و احادیث کی تعلیم کو بھی یقینی بنائے رکھنے میں کامیابی مل سکے۔

مولانا موصوف نہ تو تعلیم کو محدود تصور کرتے تھے اور نہ ہی تعلیم کی وسیع النظری اور اس کی گوناگونی سے نابلد تھے۔ وہ انگریزوں کی سیاسی پالیسی ان کی غاصبانہ حکومت اور انکی تعلیمی و تہذیبی یلغار کے مخالف تھے کیونکہ ان کا تمام تر انحصار اسلام مخالف، ہندوستان دشمنی اور مشرق کی تحقیریت پر تھا انھوں نے ہندوستان میں آپسی پھوٹ، اسلامی ثقافت اور مشرقی علوم دفنون کی تذلیل کو اپنا خاص نصب العین بنا رکھا تھا اور ہندوستانیوں کو ان کے مذہب سے بیزار کر کے ذہنی اور فکری غلامی کو فروغ دیکر ان کی سیاسی غلامی کو استحکام دینا تھا نہیں تو وہ نہ تو انگریزی زبان کے مخالف تھے اور نہ ہی جدید وعصری تعلیم کے دشمن تھے بلکہ اس کی اہمیت وافادیت سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے انھیں فکر تھی تو صرف ہندوستان میں احیائے اسلام کی اور اسی لئے انھوں نے مخصوص دینی تعلیم کو اپنی تعلیمی تحریک کا خاص محور بنایا تھا۔

<u>انگریزی زبان و تعلیم کا تصور:-</u> مولانا کے تعلیمی تصور میں اس بات کو خاص اہمیت حاصل تھی کہ ہندوستان میں مسلم نوجوانوں کی ایک ایسی تعلیم یافتہ نسل تیار کی جائے جو ٹھوس اسلامی فکر رکھتی ہو اور دین اس کے مزاج و ذہن میں رچا بسا رہے تاکہ کسی قسم کی اسلام مخالف یلغار انھیں اس سے مس نہ کر سکے چنانچہ انھوں نے اپنے دینی نصاب میں جو بعض عقلی علوم شامل کئے تھے انکا

مقصد بھی بطور خاص اسلام کا احیاء ہی تھا جیسا کہ ۹ رجنوری ۱۸۷۴ء کو دارالعلوم دیوبند کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر انھوں نے اپنی تقریر میں وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''دارالعلوم کے نصاب میں دینی علوم کے ساتھ جو علوم عقلی و نقلی رکھے گئے ہیں تو اس کا مقصد ایک طرف تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے وہ علوم جو حکومت کی بے توجہی سے زوال پذیر ہیں وہ محفوظ ہو جائیں اور دوسری طرف ان کے پڑھنے سے طلباء میں علوم جدیدہ حاصل کرنے کی استعداد و صلاحیت پیدا ہو جائے............ دارالعلوم دیوبند کے نصاب سے فارغ ہونے کے بعد اگر طلبہ سرکاری مدارس میں جا کر علوم جدیدہ حاصل کریں تو ان کے کمال میں اس سے بہت اضافہ ہوگا۔''

مولانا نانوتوی شاہ ولی اللہ کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے جن کا اپنا مخصوص سیاسی تعلیمی اور مذہبی نظریہ تھا اور جس نظریہ نے ہندوستان میں ایک عظیم ذہنی وفکری انقلاب کی بنیاد رکھی تھی چنانچہ مولانا موصوف کے پیش نظر بھی پوری اسلامی تاریخ کے نشیب و فراز تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کاتب رسول حضرت زید بن ثابت نہ صرف عبرانی اور سریانی زبان جانتے تھے بلکہ فارسی، رومی، قبطی اور حبشی زبانیں بھی جانتے تھے اور آنحضرت کی غیر زبانوں میں خط و کتابت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اسلام ساری دنیا اور قیامت تک کے لئے آخری خدائی مذہب ہے اس لئے یہ ایک توسیع ہمہ گیر اور تمام بنی نوع انسان کے لئے آیا ہے لہٰذا اس میں زبان و تعلیم کی محدودیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز جو شاہ ولی اللہ کی تحریک کے علمبردار اور تحریک دیوبند کے فکری رہنما تسلیم کئے جاتے ہیں انھوں نے خود اپنی زندگی کے آخری ایام میں دلی میں عبرانی زبان کے ایک فاضل سے حبرو زبان سیکھی تھی اور جس کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے خود اپنے ملفوظات میں فرمایا ہے کہ ''ایک بڑے عالم فاضل آگئے تو ان سے توریت کی تحقیق عبرانی زبان میں کی۔'' آپ نے عبرانی زبان کے اسی فاضل سے توریت بھی پڑھی تھی اور توریت کی چند آیتوں کا آپ نے ترجمہ بھی کیا

تھا اس لئے اس مکتب فکر سے کسی عالم ودانشور سے کسی بھی زبان اور تعلیم کے بارے میں کسی محدود اور تنگ تصور کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ خود مولانا نانوتوی نے اپنے آخری سفر حج کے دوران انگریزی زبان سیکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر موت نے آپ کو موقع نہیں دیا جیسا کہ حافظ محمد احمد سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند و پسر مولانا محمد قاسم نانوتوی کا بیان ہے کہ

''آخری سفر حج میں جب مولانا محمد قاسم نانوتوی جا رہے تھے تو جہاز کے غالباً اتالین کپتان نے لوگوں کے مولانا کے ساتھ عقیدت واحترام کے برتاؤ کو دیکھتے ہوئے یہ دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ حجاج میں سے کئی انگریزی داں مسلمان بھی تھے انھوں نے کپتان سے مولانا کے حالات بیان کئے۔ اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی مولانا بخوشی تیار ہو گئے۔ کپتان نے اجازت چاہی کہ کیا مذہبی معاملات میں بھی گفتگو کی اجازت ہے؟ مولانا نے فوراً کہا کہ بخوشی اجازت ہے۔ چنانچہ بہت سے مذہبی معاملات میں کپتان نے مولانا سے سوالات کئے اور مولانا نے اس کے جوابات بھی دیئے۔ مگر مولانا انگریزی نہیں جانتے تھے اور کپتان عربی، فارسی یا اردو سے نابلد تھا۔ چنانچہ یہ ساری گفتگو ایک انگریزی داں ترجمان کے توسط سے ہوئی۔ کپتان مولانا کے خیالات اور ان کی گفتگو سے اتنا متاثر ہوا کہ قریب تھا کہ وہ قبول اسلام کا اعلان نہ کردے۔ اس نے ہندوستان آکر مولانا سے شرف ملاقات کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اس واقعہ کا مولانا نانوتوی پر اثر ہوا کہ آپ نے اپنے آخری سفر حج میں جہاز پر ہی یہ عزم فرمالیا کہ واپس ہونے کے بعد انگریزی زبان خود سیکھونگا۔ کیونکہ مولانا نے اس ساری گفتگو کے درمیان یہ محسوس کیا تھا کہ جتنا اثر کپتان پر براہ راست گفتگو کا ہوسکتا تھا وہ ترجمان کے توسط سے نہ ہوسکا۔ لیکن افسوس کی موت نے موقع نہیں دیا۔ اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو دارالعلوم کی علمی تحریک کا رنگ ہی کچھ اور ہو گیا ہوتا۔''

بہر حال مولانا نانوتوی انھوں نے نہ تو انگریزی زبان کے ہی مخالف تھے اور نہ ہی جدید عصری تعلیم کے خلاف تھے اس لئے نہ تو انگریزی زبان سیکھنے سے مسلمانوں کو روکا نہ ہی عصری

تعلیم کے حصول سے ہی منع کیا کیونکہ وہ اسلام کے ہمہ گیر اور متنوع تعلیمی تصورات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس کا بھرپور عرفان انھیں حاصل تھا۔ ہاں انیسویں صدی کے ثقافتی اور معاشرتی حالات میں مولانا سمیت دیگر اکابرین کا یہ تصور ضرور تھا کہ اسلامی علوم وفنون سے مسلمانوں کو نابلد رکھکر محض معاشی ضرورت اور عقلی بیداری کے نقطۂ نظر سے صرف جدید یا عصری علوم کا حصول مسلمانوں میں غلط نتائج پیدا کرے گا اور ان کا یہ سوچنا بڑی حد تک درست بھی تھا۔

تعلیمی وتربیتی تصور:- اسلامی نظام تعلیم اور فلسفہ تعلیم کا بنیادی مقصد انسانی معاشرے کو بہتر ضابطۂ حیات سے ہمکنار کرنا ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کامل کے ساتھ بنی نوع انسان میں آپسی محبت، بھائی چارگی، سچائی، مساوات، امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام کا ذریعہ بن سکے۔ عالمی تاریخ کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا میں سب سے بہتر، وسیع اور متنوع نظام تعلیم اسلام کا ہی پیش کردہ رہا ہے جس سے عرب جیسے صحرائی ماحول میں ایک نیک اور صالح معاشرے کی تشکیل ممکن ہوسکی تھی جس میں عدل وانصاف، حق شناسی، حقوق العباد اور حقوق اللہ کے ساتھ پاکیزگی جیسے اوصاف کو بنیادی حیثیت حاصل تھی اور ایک ایسا ضابطۂ اخلاق استوار کیا تھا جس میں لادینیت، مادہ پرستی کو روحانیت کی ضد اور قلبی وروحانی سکون کے مخالف سمجھا جاتا تھا اور تعلیم کا رشتہ براہ راست دین واخلاق اور تہذیب وشائستگی سے جوڑ کر ایک ایسی ثقافت کی تعمیر کی جاتی تھی کہ دیکھتے دیکھتے مسلمان دنیا کی مہذب ترین اور تعلیم یافتہ قوم تصور کی جانے لگی تھی اور مسلمان اپنی تعلیمی وتہذیبی ترقی کے بام عروج پر پہونچ کر دنیا کی ترقی یافتہ قوم بن گئے تھے اور اخیر الامم کے نام سے جانے جانے لگے تھے۔ کیونکہ اسلامی نظام تعلیم اور فلسفہ تعلیم کی کردار سازی پر خاص توجہ دیجاتی تھی اور انتہائی نرم اور شفقت آمیز طریقوں سے بچوں کی تعلیم وتربیت پر زور دیا جاتا تھا جس میں نہ کسی کی دل آزاری کی گنجائش تھی اور نہ ہی بے مروتی یا حق تلفی کی اجازت تھی۔ خوش خلقی، دل جوئی، محبت وشفقت اور احترام آدمیت کے ساتھ ساتھ رضائے

الٰہی کے حصول کے لئے بنی نوع انسان کی تعلیم وتربیت کر کے دنیا وآخرت میں سرخروئی کا ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔

اسلام میں تعلیم کو ایک معاشرتی عمل قرار دیا گیا ہے اور بچوں کی تعلیم وتربیت میں بہتری، خوش اسلوبی اور نرم روی پر زور دیا گیا ہے چنانچہ خود نبی کریم کا ارشاد گرامی ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے میری تربیت وتہذیب بہتر طریقے پر کی ہے۔" چنانچہ آپ نے اصحاب کے لئے تعلیم وتربیت کا طریقہ اختیار کیا وہ نہایت عمدہ کارآمد اور منافع بخش تھا اور خود اس کا عملی نمونہ بھی پیش کیا جس کا اساسی مقصد بچوں اور انسانوں میں موجود فطری اور مخفی صلاحیتوں کو ابھار کر ان کو صحیح اور صالح سمت پر گامزن کرتے ہوئے پروان چڑھانے پر زور دینا تھا اور معرفت الٰہی وخودشناسی کے ساتھ کائنات کی حقیقتوں اور اس کے سربستہ رازوں کے انکشاف کے توسط سے معرفت خداوندی حاصل کرنا تھا اور ایسا کرنے والوں کی ہر طرح سے دلجوئی اور حوصلہ افزائی کو باعث اجر وثواب مانتا تھا۔ اسلام نے تعلیم کا نہ تو کوئی محدود یا جامد تصور پیش کیا ہے اور نہ ہی تعلیم میں کسی قسم کی محدودیت تنگی اور جمود کو راہ دی ہے۔ اسلام کے نزدیک تعلیم ایک حرکی عمل ہے جس کی ضروریات اور مسائل متحرک اور تغیر پذیر ہیں اور تعلیم فرد اور جماعت دونوں کے لئے ذہنی وفکری بیداری پیدا کرنے کا ذریعہ ہے تاکہ طالب علم آگے چل کر خدا اور خدا کی بنائی ہوئی کائنات کے ہر معاملے میں غور وفکر کر کے اور عقل وشعور سے کام لیکر خداشناسی کی منزل تک پہونچ سکے۔ چنانچہ قرآن شریف میں علم کی برتری اور کائنات میں پھیلی مختلف آیات پر غور وفکر سے متعلق متعدد آیات بھی موجود ہیں۔

مولانا نانوتوی کی تعلیم کا بنیادی مقصد بھی قرآن وسنت ہی ہے نیز انھوں نے نظریاتی طور پر بھی اسلامی اصول وضوابط کو ہی پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے تدریسی عمل کے ذریعہ بطور نمونہ پیش کر کے دکھایا ہے چنانچہ ان کے بیشتر شاگرد اپنے دور کے نامور عالم وفاضل، ماہر فن اور صاحب

کمال بنکر نکلے اور انھوں نے اپنے استاد گرامی کی تعلیمی روایات کو اس طرح زندہ رکھا کہ کئی واسطوں تک ان کے اثرات مدارس کی تعلیم وتربیت میں نمایاں طور پر محسوس کئے جاتے رہے اور جیسے جیسے ان کے اثرات کم ہوتے گئے مدارس سے ایسے افراد نکلنا کم ہوتے گئے جو مولانا محمود حسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا قاری محمد طیب اور مولانا انظر شاہ کشمیری کی جگہ لے سکیں۔

اگر چہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس اسلامیہ میں جس تعلیمی روایت کو رائج کیا تھا وہ اساسی طور پر اسلامی طریقۂ تعلیم پر ہی منحصر تھی چنانچہ یہی وجوہات تھیں کہ دارالعلوم اور مولانا نانوتوی نے اپنے طریقۂ تعلیم سے ایک موثر اور شاندار طریقۂ تعلیم وضع کیا تھا جو دراصل اسلام کے بنیادی تعلیمی وتربیتی تصور سے ماخوذ تھا جس میں وقت اور حالات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اور اس تعلیمی تصور میں امیری غریبی کا نہ کوئی امتیاز تھا اور نہ ہی غرباء کو کسی طرح نظر انداز کیا جاتا تھا اور طلباء کی ایسی فطری اور نفسیاتی انداز سے تربیت کی جاتی تھی کہ ان میں سماجی نابرابری اور عدم مساوات کا کہیں شائبہ تک محسوس نہ کیا جاسکے اور اس طرح غریب اور بے سہارا طلباء کو دینی تعلیم سے آراستہ کیا جائے کہ ان میں احترام آدمیت، قومی یکجہتی، یگانگت واتحاد کے ساتھ وطنیت اور قومیت کے جذبات سے پر ایسے افراد تیار ہوسکیں جو اسلام کی حقانیت کے ساتھ ساتھ ملک وقوم کے لئے بھی ہر قسم کی قربانی دینے سے دریغ نہ کرسکیں چنانچہ ان کے اسی تعلیمی وتربیتی تصور کا یہ نتیجہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں نے غریب طبقے نے نہ کبھی ملک کی تقسیم اور قیام پاکستان کا مطالبہ کیا اور نہ ہی ہندوستانی قومیت کو کہیں سے کمزور ہونے میں معاونت ہی کی۔ جہاں تک تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے مطالبہ کا سوال ہے اس میں عموماً نوابین، امراء، تعلقدار اور زمیندار طبقے کے لوگ شامل تھے جو اس بات سے خوف زدہ تھے کہ ملک کی آزادی اور جمہوریت کے قیام کے بعد وہ جن غریبوں کے استحصال سے اپنی برتری قائم کئے ہوئے تھے وہ ان کی برابری میں آجائیں گے لہٰذا انھوں نے اپنی مصنوعی شان وشوکت کو برقرار

رکھنے کی غرض سے ہی تقسیم ملک اور قیام پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ دوقومی نظریے کی حمایت کی اور مذہبی جنون پھیلا کر انگریزوں کی چالوں کا شکار بھی ہوئے اور قومی اتحاد کو سدا کے لئے پارہ پارہ کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے لیکن دارالعلوم دیوبند کے فارغین اور اس کے پیروؤں نے ہر حال میں متحدہ ہندوستان کے نظریے کی ہی حمایت کی تھی۔

مولانا قاسم نانوتوی کا تعلیمی وتربیتی تصور بھی خالص اسلامی طور طریقوں پر منحصر تھا اور اس میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جو اسلامی تعلیم وتربیت کے لئے لازمی تصور کئے جاتے تھے جس میں ہر قسم کی زور زبردستی اور زیادتی سے انحراف کرتے ہوئے خلوص وللّٰہیت اور رضا کارانہ طور پر اچھے افراد اور ذمہ دار شہری کی تشکیل اور ان سے ایک صالح معاشرے کی تعمیر مقصود تھی۔

تعلیمی آزادی کا تصور:- تعلیم میں ذہنی وفکری آزادی، امراء اور صاحب اقتدار افراد کی عدم مداخلت اور اساتذہ میں فکری اتحاد وتسلسل کی بڑی اہمیت بتائی گئی ہے چنانچہ مولانا نانوتوی اور ان کے رفقاء اور دارالعلوم دیوبند اور دیگر دینی مدارس کے ذمہ داروں نے بھی ہمیشہ اس کا خاص خیال رکھا کیونکہ مولانا نانوتوی اپنی تحریک دیوبند اور قیام مدارس سے جس قسم کا ذہنی وفکری انقلاب کا کام لینا چاہتے تھے اس کے لئے تعلیمی آزادی کی خاص اہمیت ہوتی ہے کیونکہ ایک آزاد فطرت استاد ہی آزادی پسند افراد کی شخصیت کی تعمیر کرنے میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے اور کوئی بھی ذہنی وفکری انقلاب تعلیم اور تعلیمی آزادی کے بغیر مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک ایسا نظام تعلیم ہی حصول علم کو لازمی بنا کر ہر شہری کو اپنے فرائض منصبی کو پہچاننے اور انھیں بخوبی انجام دینے کا اہل بنا سکتا ہے اور ایسے افراد سے ہی ایک صالح معاشرے کی توقع بھی کی جاسکتی ہے۔

مولانا نے اپنے تعلیمی تصور میں تعلیمی آزادی کی اہمیت وافادیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس پر خاص توجہ دینے پر زور دیا ہے اور تعلیم بطور خاص مملکت اور سربراہان مملکت کی خاص ذمہ داری قرار دیا ہے کہ وہ اپنی رعایا کے لئے معقول تعلیم کا بندوبست کریں چنانچہ نبی کریم مختلف

مقامات پر جو معلم بھیجتے تھے وہ یہ فرائض بلا کسی معاوضہ کے انجام دیتے تھے۔ لہٰذا دار بنی ارقم، مسجد قبا اور مسجد نبوی میں اصحاب صفہ کی تعلیم کا جو بندوبست کیا گیا تھا وہ بھی بلا معاوضہ تھا۔ آپ کے بعد خلافت راشدہ اور پھر بنی امیہ اور بنی عباسیہ کے عہد تک بھی جو تعلیمی مراکز قائم تھے جیسے بغداد، مصر، کوفہ، دمشق اور بصرہ وغیرہ شہروں میں بھی جو مدارس قائم تھے ان میں بھی بلا معاوضہ تعلیم کا بندوبست تھا اور حکومت ان مدارس کے اساتذہ اور طلباء دونوں کی ہی کفالت کرتی تھی اس کے علاوہ بعض ایسے مدارس کا بھی وجود تھا جو اہل خیر حضرات کے تعاون سے چلتے تھے مگر طلباء پر کسی قسم کا بھی بوجھ نہیں ڈالا جاتا تھا۔

مولانا موصوف نے جب اپنے تعلیمی مشن اور اس کے طریقۂ کار کا منصوبہ بنایا تھا اس وقت ریاست مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر ان دشمنوں کے ہاتھوں میں جا چکی تھی اور جو حکومت تھی وہ اسلام دشمن مسلم مخالف اور ہندوستانی مسلمانوں کی خاص حریف تھی اس لئے اس سے کسی قسم کے تعاون یا ہمدردی کی امید ہی بے سود تھی لہٰذا آپ نے دوسرا طریقہ اپناتے ہوئے اہل خیر افراد اور غرباء کے تعاون کو خاص اہمیت دی اور مفت تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء کے قیام وطعام کا بھی نظم کیا تا کہ طلباء بلا کسی ضروری بے سکونی اور بے امانی کی یکسوئی اور آزادی کے ساتھ حصول تعلیم میں لگ جائیں اور انھوں نے بلا کسی بلند وبانگ دعویٰ کے انتہائی خاموشی سے اپنے تعلیمی منصوبوں کو بروئے کار لا کر انھیں عملی جامہ پہنایا اور اپنے تعلیمی آزادی کے تصور کو بطور خاص آزادانہ اور اطمینان بخش بنانے میں خاص معاونت کر سکے۔

نبی کریم بھی صحابۂ کرام کو جو تعلیم دیتے تھے اور جس کے عملی نمونہ کے ظور پر وہ خود اپنی ذات گرامی کو پیش کرتے تھے اس میں بھی آزادئ رائے اور عملی طریقۂ کار کو خاص اہمیت دیتے تھے چنانچہ اسلامی تعلیمی نظام ایک فعال نظام تعلیم کو نظری اور عملی تعلیم کا مرکب بنانے پر خاص زور دیا گیا تھا آپ نے بھی اسی تعلیمی وتربیتی نظام تعلیم کو رہنما بنا کر مذہبی تعلیم وتربیت کا خاص محور سمجھتے

ہوئے ایک ایسے نظام کو وجود پذیر کیا کہ وہ خالص اسلامی روایات کے مطابق ہی ڈھل گیا تھا اور جو نظام تعلیم وتربیت رائج ہوا تھا نئے حالات ومعاملات میں اتنا کامیاب ہوا کہ وہی طریقہ آج تک نہ صرف باقی ہے بلکہ پوری طرح جاری وساری بھی ہے اور جس میں مذہبی تعلیم وتربیت کے زیر اثر تعلیمی آزادی کے تصور کو فروغ دیا جا سکے۔

رشتۂ استاد وشاگردی کا تصور:۔ تعلیم وتعلم کے عمل میں استاد وشاگرد ہی سب سے اہم کردار ہوتے ہیں اور انہیں دونوں کے رابطے سے تعلیمی عمل وجود پذیر ہوتا ہے۔ تعلیمی عمل کے ایک سرے پر استاد ہوتا ہے تو دوسرے سرے پر طالب علم اور دونوں کا ایک دوسرے سے جو رشتہ ہوتا ہے وہ انتہائی نازک اور پاکیزہ ہوتا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں استاد طالب علم کو قومی اور ملی امانت تصور کرتا ہے اور اس کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل کے لئے وہ سراپا خلوص ومحبت بن جاتا ہے اور کسی معمولی سی غفلت وکوتاہی کو دنیا وآخرت میں جواب دہی کا سبب سمجھتا ہے وہ صرف دوران تدریس ہی اپنے شاگردوں کا ذمہ دار نہیں ہوتا بلکہ زندگی کے ہر معاملے میں اسکی صحیح رہنمائی کو اپنا فرض اولین مانتا ہے اور ہر وقت اپنے طالب علموں کے لئے فکر مند رہتا ہے جس سے طلباء بھی اپنے اساتذہ کے لئے دل وجان سے ہر قسم کی خدمت اور قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں۔

مولانا نے اپنے تعلیمی تصورات میں استاد وشاگرد کے اسی پاکیزہ رشتہ کو اہمیت دیتے ہوئے اپنے شاگردوں کے ساتھ بہتر سلوک کر کے اس کا نمونہ پیش کیا اور اس رشتہ میں مضبوطی اور استحکام پر زور دیا تاکہ وہ جو تعلیمی تحریک شروع کئے تھے وہ نسلاً بعد نسلاً آگے بڑھ سکے اس کے علاوہ ان کے پیش نظر چونکہ مذہبی تعلیم اور کتاب وسنت کے احیاء اور علم وآگہی کا اعلیٰ تصور تھا اس لئے وہ خود بھی اپنے طلباء سے انتہائی شفقت کا برتاؤ کرتے تھے ان کے تعلیمی مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے میں لگے رہتے تھے اور ان کی ہر طرح کی اخلاقی امداد کے لئے تیار رہتے تھے ان کا طریقہ تدریس بھی انتہائی عالمانہ مگر دلچسپ ہوتا تھا پھر بھی وہ اپنے شاگردوں کے طبعی میلانات

اور سبق میں عدم دلچسپی کے معاملات کو سمجھنے میں لگے رہتے تھے اور اگر کہیں اپنی تدریس میں کوئی کمی آجاتی تھی یا کوئی اس جانب متوجہ کر دیتا تھا تو بلا کسی جھجک کے رجوع کر لیتے تھے چنانچہ مولانا عبدالعلی صدر و شیخ الحدیث مدرسہ عبدالرب دہلی، جب شروع میں مولانا سے پڑھنے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شاید ''صدرا'' یا ''شمس بازغہ'' فلسفہ کی کوئی کتاب پڑھنا شروع کئے اور کتاب کی عبارت جیسے ہی ختم ہوئی مولانا نے فرمایا کہ بس بس ختم کرو میاں اس مسئلہ میں قاسم کی سن لو پھر ان کو سمجھنا۔ مولانا عبدالعلی صاحب نے جب ان کے درس کا یہ انداز دیکھا تو چپکے سے چلے گئے۔ مولانا کو ان کے جانے کا افسوس ہوا۔ چنانچہ مولانا ان کے گھر گئے اور اس طرح چپکے سے چلے آنے کا سبب دریافت کیا۔ مولانا عبدالعلی صاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''حضرت! میں تو آپ سے کتاب پڑھنے کے لئے گیا تھا۔ آپ تو بجائے کتاب کے قاسم کی سنانے لگے۔'' چنانچہ مولانا نے وعدہ فرمایا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ کتاب ہی پڑھاؤں گا۔ اس طرح مولانا عبدالعلی دوبارہ پڑھنے کے لئے واپس آگئے۔

مذکورہ واقعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مولانا نے رشتۂ استاد و شاگردی کو اپنی سابقہ روایات کے مطابق نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس میں مزید گہرائی و گیرائی پیدا کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے کے طور پر اسلامی مدارس میں استاد و شاگرد کے تعلق کو فروغ ملا مگر ان کے بعد دو تین واسطوں تک ہی یہ سلسلہ اپنی اصل صورت پر برقرار رہ پایا اور جیسے جیسے اس میں کمی پیدا ہوتی گئی اپنے استاد کے تعلیمی وارث کی حیثیت سے علماء کم ملنے لگے چنانچہ دیسے خال خال ہی استاد نظر آتے ہیں جو اپنے شاگردوں سے مولانا کے قائم کردہ استاد و شاگردی سے پیش آتے ہوں جس کا نتیجہ یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ اب دینی مدارس بھی دھیرے دھیرے پروفیشنل ہوتے جارہے ہیں اور اس کی ایک دوسری بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مدارس میں امراء اور نو دولتیوں کا اثر و رسوخ بڑھ گیا ہے جس سے اقربا پروری لائق فائق اساتذہ کا فقدان ہوتا جارہا ہے جبکہ مولانا نے اسی خدشہ کے

پیش نظر اپنے اساسی اصول ہشتگانہ میں تحریر فرمایا تھا کہ ''نامقدور ایسے لوگوں کا چندہ مجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائنداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔''

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ دینی مدارس کی کفالت مسلم سماج کرتا ہے جس میں پورے معاشرے کا تعاون شامل ہوتا ہے اگر چہ خوشحال اور مالدار لوگ زیادہ مقدار میں معاونت کرتے ہیں جبکہ غریبوں کی اعانت کم مقدار میں ہوتی ہے لیکن مجموعی طور پر غربا کی اکثریت ہے اسلئے ان کا مجموعی چندہ امیروں سے کئی گناہ زیادہ ہوتا ہے لہٰذا مدرسوں کے اصراف میں غریبوں کی حصہ داری زیادہ ہوتی ہے اگر غریب پچاس روپیہ چندہ دیتا ہے تو اس میں خلوص ادارہ سے ہمدردی اور للٰہیت شامل ہوتی ہے جبکہ امیر طبقہ زیادہ چندہ دیکر اس کے بدلے میں رکنیت اپنے بھائی بھتیجوں اور رشتہ داروں کی شمولیت چاہتا ہے جس سے مدرسے کے معمولات میں دخل اندازی ہوتی ہے اور مدرسہ چند لوگوں کی اجارہ داری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ مدرسہ کے اساتذہ اور فارغین وطلباء بھی زیادہ تر امیروں کی طرف ہی متوجہ دکھائی دینے لگتے ہیں۔ کیونکہ انھیں ایسے لوگوں کی مالی منفعت کی امید ہوتی ہے لہٰذا وہ بھی غریبوں کی طرف توجہ کرنے سے گریز کرنے لگتے ہیں۔ جو مدارس کے قیام کے بنیادی تصور کے خلاف ہے چنانچہ یہی وجوہات ہیں کہ ان مدارس میں بھی اقرا پروری، مفاد پرستی اور سیاسی عدم کردار کا ماحول بڑھنے لگا ہے۔ جس سے درس وتدریس سے لیکر انتظام وانصرام اور رشتہ استاد وشاگردی پر بھی منفی اثر پڑنے لگا ہے۔ اور مولانا نانوتوی کا قائم کردہ رشتۂ استاد وشاگردی کا تصور بھی دھیرے دھیرے مفقود ہوتا محسوس ہونے لگا ہے۔

<u>طریقۂ تعلیم کا تصور:</u> - اسلامی مدرسوں میں بزرگوں نے جو طریقۂ تعلیم رائج کیا تھا وہ کوئی نیا نہیں تھا بلکہ وہی قدیم مشرقی طریقہ تھا جو عموماً ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں میں رائج تھا

جس میں ابتدائی درجوں ہفتہ کے آخری دن آموختہ یاد کرنے اور سبق کا اعادہ کرنے کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ دوسرا طریقہ جو اونچے درجات میں رائج تھا وہ یہ تھا کہ ہر سبق کے آغاز سے قبل طلباء کو پیشگی مطالعہ کرنا ہوتا تھا اور اسی پیشگی مطالعہ کے دوران طلباء عموماً شبہات کی نشان دہی کرلیا کرتے تھے اور تدریس کے دوران اساتذہ ان کی وضاحت وتشریح کردیا کرتے تھے اور اس سے طلباء کی تعلیمی دلچسپی، طبعی میلانات اور پیش رفتی کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔ اس طریقہ سے جہاں استاد کی علمی صلاحیت اجاگر ہوتی تھی وہیں طلباء کے ذوق وشوق کا بھی پتہ چلتا تھا اور جس طالب علم میں عدم دلچسپی اور فطری رجحان کی ہوتی تھی اساتذہ اسکا احساس کرلیا کرتے تھے چنانچہ مختلف نفسیاتی اور تدریسی طریقوں سے اس کی جانچ پرکھ کر کے اس کی وجوہات کا پتہ لگاتے تھے اور ان کے تعلیمی مسائل اپنے طریقوں سے حل نکالتے تھے جس میں اساتذہ کا خلوص، استادانہ شفقت ومحبت اور طالب علموں سے اس کے تعلق خاطر کو فروغ ملتا تھا اور تعلیم وتعلم کی ایسی فضا تشکیل پاتی تھی جس میں استاد وشاگرد دونوں ایک دوسرے کے لئے معاون بن جاتے تھے جس تعلیمی وتدریسی عمل کی تکمیل میں خوشگواری اور بہتر امکانات کی کارفرمائی اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ جاتی تھی اور اس طریقۂ تعلیم سے حصول مقاصد کی تکمیل میں بھی مدد ملتی تھی۔

استاد کا کام طلباء کو محض معلومات فراہم کرانا نہیں ہوتا تھا۔ یہ کام تو خبری اور مخبر کا ہوتا ہے۔ استاد کا اصل کام طلباء میں سیکھنے اور علم حاصل کرنے کے ذوق وشوق کو اجاگر کرنا ہے اور اس کے اندر موجود فطری صلاحیتوں کو جلا بخشنا ہے تاکہ وہ علم وآگہی کا عرفان حاصل کرکے اپنی خداداد صلاحیتوں سے خود کو اور معاشرے کو فائدہ پہونچا سکیں چنانچہ ہمارے علماء اور ماہر فن اساتذہ نے اپنی تدریس میں طریقۂ بحث کو بڑی اہمیت دی تھی اس سے طلباء میں مختلف نکات کی افہام وتفہیم کے ساتھ ساتھ بہتر طریقے سے اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کا طریقہ پیدا ہوتا تھا اور دوران تدریس جو سوالات وجوابات ہوتے تھے اور جسے طریقۂ بحث ومباحثہ کا نام دیا جاتا تھا اس سے

جہاں طالب علموں کی ذہنی اور مطالعاتی تیاریوں کا پتہ چلتا تھا وہیں ان کے اندر خطابت کی صلاحیت کو بھی فروغ ملتا تھا چنانچہ اگر کوئی طالب علم دوران تدریس خاموش رہتا تھا تو استاد کو اسکی عدم توجہی کا پتہ چل جاتا تھا اور وہ اسکی جانب اپنی توجہ فوراً مبذول کر دیتا تھا اور اسکے تعلیمی ودیگر مسائل کو سمجھنے اور اس کے حل میں لگ جاتا تھا۔ چنانچہ ماہرین فن اساتذہ اپنے طالب علموں کو دوران تدریس سوال وجواب کے لئے اکساتے تھے تاکہ طلبہ میں خودنگری کے ساتھ ساتھ مصنفین ومنکرین کی آراء کو سمجھنے اور اپنے تعلیمی عمل کی خود جانچ پرکھ کرنے کی بھی صلاحیت پروان چڑھ سکے۔

مذکورہ طریقہ تعلیم میں سوالات میں جیسی گہرائی وگیرائی ہوتی تھی اور شبہات میں جس قسم کی وصعت وہمہ گیری ہوتی تھی اسی لحاظ سے طلبہ کی صلاحیت میں اضافہ اور اسکے علم وآگہی کی تسلسل میں ترقی ہوتی تھی اور یہی دراصل اس طریقہ تعلیم کی جانچ پرکھ اور دیلویشن ہوتا تھا اور ان کے لئے فراغت کا دن موجودہ دور کے امتحان کی طرح قیامت کا دن نہ ہوکر دلی خوشی ومسرت کا دن ہوتا تھا اسلامی مدارس میں تعلیم اور تعلیمی عمل کے جانچ پرکھ کے یہی طریقے رائج تھے اور آج بھی اسلامی مدارس میں اگر کلی طور پر نہ صحیح تو جزوی طور پر یہی طریقے رائج ہیں۔ طلباء کی صلاحیتوں کی جانچ پرکھ کا جو اسلامی طریقہ صدیوں سے اسلامی درسگاہوں میں رائج تھا وہی طریقہ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دارالعلوم دیوبند اور دیگر اسلامی مدارس میں رائج کیا تھا اور تقریباً نصف صدی تک اسکے بہتر نتائج بھی دیکھنے میں آتے رہے کیونکہ پورا نظام تعلیم ہی خلوص اور للہیت پر مبنی تھا۔ مگر بعد میں جیسے جیسے نئے حالات اور انگریزوں کے رائج کردہ جدید امتحانات کے طریقوں کے اثرات ان مدارس پر بھی پڑنے لگے۔ اور ماہر فن اساتذہ اور مخلص لوگوں کی کمی ہوتی گئی مدارس کا آموختائی اور بحث ومباحثہ کا طریقہ بھی کمزور پڑتا گیا اور جو نئے طریقے جزوی طور پر شامل ہوئے وہ تدریسی نقطہ نظر سے مفید نہیں تھے۔ اسلئے تدریسی عمل پر منفی اثرات مرتب ہونے لگے

اور ایک بہت بڑی خوبی جو اس تعلیمی طریقہ میں اعادہ کی تھی جس سے استاد کے پڑھائے ہوئے سبق کے اثرات طالب علم پر زود اثری کے ساتھ نمایاں ہونے لگتے تھے۔ وہ بھی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔

مدارس میں جو تعلیمی طریقے رائج تھے اس میں مانیٹیری سسٹم بھی شامل تھا یعنی اساتذہ بعض ذہین اور ہوشیار طالب علموں کو منتخب کر کے ان سے استاد کے پڑھائے سبق کو دہرواتے تھے یا مشترکہ طور پر آزادانہ یاد کرواتے تھے یا نچلی جماعت کے طلباء کو پڑھواتے تھے اس سے فوری جو فائدہ سامنے آتا تھا وہ یہ تھا کہ ذہین اور باصلاحیت طلباء کی تعلیم کے ساتھ ہی تدریسی تربیت بھی ہوتی رہتی تھی اور پھر انہیں معلمی کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے الگ سے عملی تدریسی ٹریننگ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی اور عموماً وہی طلباء فراغت کے بعد تدریسی پیشہ اختیار کرتے تھے تو اپنے اسلاف کی علمی روایت کو برقرار رکھنے کے ساتھ ہی انکے تعلیمی اور تدریسی تصورات کو عملی طور پر جاری بھی رکھتے تھے اور اپنے اساتذہ کے نام کو بھی روشن رکھتے تھے۔ لیکن اب مدارس کی تعلیم سے یہ طریقہ بھی دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اپنے طریقہ تعلیم کے تصور سے مدارس کی تعلیم کو جو آگاہی دی تھی اور جو عملاً ایک عرصہ تک رائج بھی رہے اور آج بھی اس کے اثرات کسی نہ کسی صورت میں کہیں نہ کہیں نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے دور کی مدارس کی تعلیم کے لیے انتہائی موزوں اور کارآمد تھے۔ مولانا نانوتوی کے تعلیمی مقاصد بڑے وسیع تھے اور انھوں نے دراصل تعلیم کو بطور ذریعہ کے استعمال کیا تھا اور اصل مقاصد کے حصول کے لئے جو طریقہ کارآمد اور مفید تھے انھیں پر انکے تمام تر تعلیمی تصورات منحصر تھے جیسا کہ مولانا سید ابوالحسن ندوی رقم طراز ہیں:۔

بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ صرف ونحو کی تعلیم اور علوم عالیہ وآلیہ کی مجرد تدریس کے لئے مرکز قائم کریں اس کے لیے مصر جامعہ ازہر، تیونس

پیشہ وارانہ تربیت کا اہتمام کیا جاتا تھا اس کا مقصد بھی طلباء کی فراغت کے بعد معاشرے کی ضرورت کی تکمیل تھا۔ مسلمانوں نے کبھی بھی تعلیم کو ذریعہ معاش کے طور پر نہیں استعمال کیا ہے اور نہ ہی مسلم معاشرے میں تعلیم کا کبھی اتنا محدود تصور رہا ہے۔

اسلام میں تعلیم کا مقصد صرف انفرادی اصلاح نہ ہو کر پورے معاشرے کی اصلاح اور صالح معاشرے کی تشکیل رہا ہے اس لئے اسلام نے مقاصد تعلیم کے تعین میں نہ تو فرد کو نظر انداز کیا ہے اور نہ ہی معاشرے کو اور نہ ہی کسی ایک مفاد پر دوسرے کے مفاد کو قربان کیا ہے۔ اس کے نزدیک معاشرے کی بہتری اور خوشحالی مقاصد کے تعین پر منحصر ہوتی ہے چنانچہ گیارھویں صدی میں بوعلی سینا اور امام غزالی نے پیشوں کی تعلیم کو جو اہمیت دی تھی اس کا خاص مقصد بھی کامیاب اور ذمہ دار شہری پیدا کرنا تھا ساتھ ہی بچوں میں اعلیٰ کردار و اخلاق کے ساتھ ساتھ صحت، صفائی، محنت، ضبط نفس اور دیانتداری کے اوصاف پیدا کر کے بہتر معاشرے کی ہی تعمیر و تشکیل مقصود تھی نہ کہ علم سے معاش کے کام لینے کی پالیسی کو اہمیت دی گئی تھی۔ چنانچہ مولانا انور شاہ کشمیری نے تحصیل علم کے مقاصد پر جو روشنی ڈالی ہے وہ دراصل حضرت مولانا نانوتوی کے ہی مقاصد تعلیم کے تصور کی عکاسی ہے موصوف رقم طراز ہیں کہ:

> ''جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں انکا مقصد تحصیل علم سے یا تو دین ہوتا ہے یا فقط دنیا۔ ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو علم کو محض علم کے لئے حاصل کرتے ہیں یہ بھی غنیمت ہے لیکن علم سے معاش کا کام لینا اور اسی مقصد کے لئے اسے حاصل کرنا ایک بدترین معصیت ہے۔ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی ہے جو بازار سے ایک قیمتی شال محض اس لئے خریدتا ہے کہ وہ اس سے اپنے جوتے صاف کریگا۔''

مذکورہ صفحات میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کے جن تعلیمی تصورات پر اجمالاً روشنی ڈالی

گئی ہے وہ اپنے دور کے لحاظ سے بھی اور بعد کے حالات کے لحاظ سے بھی اور مقاصد کے اعتبار سے بھی جن کی تکمیل وتحصیل کے لئے دیوبند تحریک چلائی گئی تھی اور پورے غیر منقسم ہندوستان میں اسلامی مدارس کے قیام کو ضروری سمجھا گیا تھا۔ انتہائی مفید اور کارآمد تھے اور انھوں نے ان سے جن انقلابی نتائج کی امید کی تھی وہ مستقبل میں ایک ایک کر کے پورے ہوئے چنانچہ ان کی تحریک دیوبند وقیام مدارس سے ہندوستان میں کلام اللہ اور سنت نبوی کی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔ احیاء اسلام کو بڑی حد تک کامیابی ملی۔ ہندوستانی مسلمانوں میں حریت پسندی اور قومیت کے جذبے کو بڑھاوا ملا اور ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کی ۱۹۴۷ء کی آزادی سے بڑی حد تک تلافی ہوئی اگرچہ اس آزادی کے ساتھ ہی ملک تقسیم بھی ہو گیا مگر اس تقسیم کے ذمہ دار نہ مدارس دیوبند کے علماء ہیں اور نہ ہی ان کے پیرو عوام الناس ہی ہیں۔ علمائے دیوبند، جمعیۃ العلماء اور دیگر اسلامی تنظیموں نے تقسیم ملک اور قیام پاکستان کی زبردست مخالفت کی اور ہندوستان میں تمام تر فرقہ پرستی کی گرم بازاری کے باوجود ایک سکولر جمہوری دستور اساسی کے نفاذ میں کامیابی حاصل کی اس طرح مولانا نانوتوی کے سارے تعلیمی تصورات جو بعض مخصوص مقاصد کے پیش نظر تشکیل ہوئے تھے وہ اپنے مقاصد اور حالات کے پس منظر میں انتہائی کارآمد، مفید اور انقلاب آفریں تھے۔

کتابیات

۱- مولانا محمد قاسم نانوتویؒ حیات اور کارنامے — مولانا اسیر ادروی

۲- علمائے ہند کا شاندار ماضی — مولانا سید محمد میاں

۳- تذکرہ علمائے ہند — مولانا رحمٰن علی

۴- سوانح علمائے دیوبند — ڈاکٹر نواز دیوبندی

۵- تاریخ دارالعلوم دیوبند — مولانا سید محبوب رضوی

۶- نظام تعلیم وتربیت (جلد اول) — مولانا سید مناظر احسن گیلانی

۷- تحریک ریشمی رومال — مولانا سید میاں

۸- تاریخ تعلیم ہند — سید نورنور اللہ رجے۔ پی۔ نائک

۹- سرسید احمد خاں اور ان کا عہد — پروفیسر ثریا حسین

۱۰- ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز — بہار برنی

۱۱- تحریک آزادی ہند اور مسلمان — محمد احمد صدیقی

۱۲- مآثر الکرام — مولانا آزاد بلگرامی

۱۳- رودکوثر — شیخ محمد اکرام

۱۴- روزنامہ الجمعیۃ دہلی۔ دارالعلوم دیوبند نمبر (۲۶ر مارچ ۱۹۸۰ء) مرتبہ ناز انصاری

۱۵- ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی (دینی مدارس نمبر (۱۸را کتوبر ۲۰۰۲ء) مرتبہ محمد سالم جامعی

۱۶- India Devided by Dr. Rajandra Prasad

۱۷- The Indian Musalmans by W.W. Hunter.

MAULANA MD. QASIM NANAUTWI

KE TALEEMI TASAUWARAT

By. Dr. M. Naseem Azmi

ADEELA PUBLICATIONS
DOMANPURA (KASARI) MAUNATH BHANJAN (U.P.) 275101